اسلامی قانون کی لاثانی حقیقت

مصنّف۔ سیّد حبیب الحق ندوی [۱]
مترجم۔ محمّد شریف بن فاضل [۲]

اسلام بعض دیگر مذاہب کی طرح چند رسم و رواج کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک مکمّل طرزِ زندگی ہے۔ اس کی بنیاد وحیِ الٰہی ہے۔ جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل فرمایا تھا۔ اسلام بنی نوعِ انسان کو، اس کی تہذیب و ثقافت اور تصوّر کائنات کو دینی فلسفیانہ اور حقیقت پسندانہ انداز سے پیش کرتا ہے۔ اس کا سارا زور وجود باری تعالےٰ اور اس کے بھیجے ہوئے سرچشمۂ ہدایت پر ہے۔ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ساری کائنات

---

[۱] فاضل مصنّف سیّد حبیب الحق ندوی صاحب، پروفیسر و ناظم، شعبۂ عربی، اردو اور فارسی، ڈربن یونیورسٹی۔ ویسٹ وِل (بھارت نژاد طلبا کی جامعہ)، جنوبی افریقہ، نے اصل مضمون انگریزی زبان میں لکھا ہے۔ جو "سہ ماہی اسلامک آرڈر (ISLAMIC ORDER)"، کراچی (چوتھی سہ ماہی - ۱۹۸۸م)، جلد نمبر - ۱۰، شمارہ نمبر - ۴، میں شائع ہو چکا ہے۔ مضمون کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے انگریزی جاننے والے حضرات اصل مضمون کا ملاحظہ بھی فرما سکتے ہیں۔

[۲] مترجم جس ادارہ سے وابستہ ہے، وہ ادارہ ترجمہ میں کسی قسم کی غلطی اور تسامح کا قطعاً اور کسی طور سے بھی ذمہ دار نہ ہوگا۔ لہذا تمام تر ذمہ داری مترجم پر عائد ہوگی۔ نیز بندہ اپنے ان ساتھیوں کا بھی ممنون ہے جنھوں نے ترجمہ کو جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں تعاون کیا اور ترجمہ کے سلسلے میں رہنمائی فرمائی۔ علاوہ ازیں میں فاضل مضمون نگار کا بھی شکر گذار ہوں کہ انھوں نے ازراہِ کرم گستری مجھے اردو ترجمہ کی اشاعت کی اجازت عنایت فرما دی۔ مترجم۔

کا مقتدرِ اعلیٰ، قادرِ مطلق اور احکام و قوانین کا منبع اور اصل ہے اور انسان کی حیثیت زمین پر اس کے نائب کی ہے۔ چنانچہ وہ اس بات کا پابند ہے کہ مشیّت ایزدی کا تابع رہے ساری کائنات پر اللہ تعالیٰ کی حکمرانی ہے۔ (سورہ یٰس۔ ۳۸ تا ۴۰) فرستادۂ اوّل حضرت آدم علیہ السّلام کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم دیا گیا تھا کہ قانونِ الٰہی کو رائج کرو۔ (سورۂ یٰس۔ ۶۰ [لہ]) ۔ اور دیگر انبیائے کرام علیہم السّلام کو بھی یہی حکم ہوا تھا کہ خدا کی زمین پر دینِ الٰہی کو نافذ کرو۔ (سورۂ شوریٰ ۔ ۱۳)

مندرجہ بالا حقیقت کے پیشِ نظر اسلام میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ مذہب ایک کا ہو اور قانون کسی اور کا! اسلامی قانون موت کے بعد والی زندگی میں جزا و سزا کے عقیدے کو راسخ کرتا ہے، یومِ حساب کے تصوّر کو پختہ کرتا ہے اور خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرمانبرداری پر آمادہ اور گامزن کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق اور شارع احکام اور سزاوارِ بندگی ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق اُخروی زندگی میں سزا کا خوف، بہ نسبت سخت ترین تعزیری قوانین کے، گناہ اور بدی کے ارتکاب سے روکنے میں زیادہ مؤثر اور کامیاب ہے۔ جو خدا کا نافرمان ہے وہ نہ صرف شریعتِ الٰہی کو پامال کر رہا ہے، بلکہ شریعتِ اسلامی کی رو سے، اس سے گناہ بھی سرزد ہو رہا ہے۔ اس طرح اسلامی قانون اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہی کا احساس پیدا کرتا ہے۔

وحیِ الٰہی کا قانون منشائے الٰہی کا ترجمان ہے۔ چنانچہ تقدّم بھی اسلامی ریاست کو نہیں بلکہ اسلامی قانون کو حاصل ہے۔ یہ مسلم معاشرے کے تابع نہیں، بلکہ مسلم معاشرہ اس کے تابع ہے۔ مسلم معاشرے اور اسلامی ریاست کا مقصدِ وجود اسی قانون اور شریعت کا نفاذ

لہ انگریزی متن میں قرآن مجید کا حوالہ (سورۂ روم ۔ ۳۶) ہے لیکن محوّلہ آیت کریمہ میں حضرت آدم علیہ السّلام کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ عین ممکن ہے کہ حوالہ کی یہ غلطی کسی اتفاقیہ تسامح کی بنا پر واقع ہوگئی ہے۔ مترجم۔

ہے اور یہی قانون اور یہی شریعت صراطِ مستقیم کی جانب رہنمائی کرتی ہیں ۔ اور یہ دونوں رسم و رواج کی نفی کرتی ہیں ۔ اسلام میں ایک مثالی زندگی رضائے الٰہی کے حصول اور اس کے قانون و ہدایت کے مطابق گذر بسر کرنے سے عبارت ہے ۔ یہ حقوق و فرائض کا مجموعہ ہے، ابدی ہے، منصفانہ ہے، تمام زمانوں اور تمام انسانوں کے لیے قابلِ عمل ہونے کی خصوصیت کا حامل ہے ۔

اسلامی قانون اجتہاد کا حق دیتا ہے ۔ اس میں مجتہدین کی آراء کی گنجائش نے اسے ایک متحرک طاقت بنا دیا ہے اور قانون سازوں کے لیے یہ گنجائش پیدا کر دی ہے کہ وہ اسلامی قانون کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اخذ و اختیار اور استنباط و استخراج سے کام لیتے رہیں ۔ اسلام انسان کی تمام زندگی کا احاطہ کرتا ہے خواہ یہ انفرادی ہو یا سماجی، ظاہری ہو یا باطنی، اور قومی ہو یا بین الاقوامی ۔

انسان کے وضع کردہ قوانین

انسان کے وضع کردہ قوانین کے ساتھ بنیادی المیہ یہ ہے کہ یہ فلسفۂ اخلاق اور انسان کے مقصدِ وجود سے بے ربط ہیں ۔ یہ بالکلیہ قومی اور علاقائی مفادات و ملحوظات، ذاتی پسند و ناپسند، عصبیّت اور جانبداری پر مبنی ہیں ۔ ان کے برعکس، قانونِ خداوندی کسی قبیلہ کے سردار، کسی ظالم و جابر فرد یا پارلیمنٹ کی منظوری سے ماورا ہے ۔ تمام انسانی ساختہ قوانین میں پائی جانے والی قانونی بدنظمی اور فلسفیانہ ابتری دور سے نظر آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت جو مکاتبِ قانون موجود ہیں ۔ ان میں مآل پسندوں اور انجام پرستاروں کا دعویٰ یہ ہے کہ قانون صرف انسانی عقل و سوچ کی پیداوار ہے ۔ وہ فلاسفہ / ہستیاں جو معاشرتی قوانین (قانونِ عمرانیات) کے معتقد ہیں، وہ اصولاً نوعِ انسان کی ضروریات سے بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں . . . اور وہ لوگ جو تاریخی مکتبۂ فکر کے حامی ہیں، ان کی رائے ہے کہ قانون کا مصدر رواج ہے ؛ جو افرادِ معاشرے کے ذہنوں میں پیوست رہتا ہے ۔ بعض دیگر مکتبۂ فکر کے حامیوں کا خیال ہے کہ نظریۂ

قانون کو قانون کی اچھائی یا بُرائی سے قطعاً کوئی سروکار نہیں ہے۔ جبکہ بعض حضرات نظریۂ افادیت پرستی کی حمایت کرتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قانون عمل کا انحصار افادیت پر ہے۔ اور اس کو مدِّنظر رکھتے ہوئے قانون سازی کا واحد مقصد زیادہ سے زیادہ افرادِ معاشرہ کی بدرجہ اتم بہبود ہونا چاہیے۔

مختصراً جدت پسند طبقہ پُرلطف اور لذّت آمیز مسرّت و شادمانی کو بطور بڑی بہتری کے تسلیم کرتا ہے۔ جس پر موجودہ تمام قوانین مبنی ہیں، جبکہ یہ تمام قانونی موشگافیاں اور فلسفے اسلام کے منافی اور ناموافق ہیں۔ کیونکہ اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ ہر انسان اپنے ناقص علم اور محدود قابلیت کی بنا پر اپنی روحانی و مادی خوشحالی اور اُخروی نعمتوں کے حصول کے لیے ہدایتِ الٰہی اور قانونِ خداوندی کا محتاج ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں، فوز و فلاح ایسی زندگی میں مضمر ہے، جو مرضیِ مولا کے تابع ہو۔ جبکہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ نوعِ انسان کی بھلائی اور بہتری کس چیز میں ہے۔

شریعت پر طعن و تشنیع

اٹھارویں و انیسویں صدی میں، مغربی نوآبادیاتی طاقتوں نے اسلام کے خلاف زبردست یورش کی، جسے ہم مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ قرار دے سکتے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو عقیدۂ اسلام کی بدولت مردہ ضمیر قرار دیا۔ نیز عقیدۂ اسلام، اسلامی زبان اور ثقافت، اسلامی تاریخ اور اسلامی قانون کو مسخ کر کے پیش کرنا اور قطع و برید کر کے ان کو بدنما اور بدشکل بنانا شروع کر دیا۔ اسلامی اور شرعی قانون کے احیاء کے لیے اٹھنے والی تمام تحریکوں پر یا تو پابندی عائد کر دی تھی یا پھر ان کو کچل دیا۔ نیز علماء اور مصلحین کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں اور ان کو پھانسیوں پر چڑھایا۔ مسلم ممالک میں قوانینِ شرعیہ کو کہیں انگریزی قانون سے بدل دیا، کہیں فرانسیسی قانون سے اور کہیں ولندیزی قانون سے۔ اپنے اس عمل کو تسلسل دینے کے لیے انہوں نے مسلم نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ بھیجا اور اس حد تک ان کی ذہنیت مسخ کی گئی کہ وہ نوآبادیاتی آقاؤں کے وکیل اور

نمائندے بن بیٹھے ۔ نئے قوانین جیسے اینگلو۔ محمڈن قوانین اور فرنیکو۔ محمڈن قوانین کو بطورِ مصالحت و راضی نامہ متعارف کرایا گیا ۔ سرکاری قوانین یعنی دستوری ، فوجداری ، دیوانی اور تجارتی قوانین کو کلّی طور پر تبدیل کر دیا گیا اور اسلامی قوانین کو فرسودہ ، ناقابلِ عمل اور زمانۂ قدیم کے رسم و رواج قرار دیا گیا ۔

چار اہم اعتراضات

قوانینِ شرعیہ کے خلاف اٹھائے گئے اعتراضات کی تلخیص حسب ذیل ہے :

۱ ۔ اسلامی قوانین قدیم و متروک اور موجودہ زمانہ کے لیے ناقابلِ عمل ہیں ۔

۲ ۔ شرعی قانون بربریت کی یادگار ہے ۔

۳ ۔ یہ اپنی ہئیت اور مزاج کے لحاظ سے فرقہ واریت اور گروہ بندی کو جنم دیتا ہے ۔

۴ ۔ قانونِ اسلام کے تحت ، غیر مسلم اقلیتیں اپنے تئیں خود کو غیر محفوظ و غیر مستحکم اور خوف زدہ محسوس کرتی ہیں ۔

لہٰذا اسلامی قانون کے طالب علم پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ ان چار اہم نام نہاد اعتراضات کا بنظرِ غائر جائزہ لے ، جو اسلامی قانون کی مخالفت میں پیش کیے گئے ہیں ۔

۱ ۔ قدامت پسندی

اسلامی قانون کو پرانا رسم و رواج قرار دینے کے ضمن میں استدلال یہ کیا گیا کہ چودہ صدیاں بیشتر جو قوانین عربوں کی اوّلین سوسائٹی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے وضع کیے گئے تھے ، وہ یقیناً روشن خیالی کے دور کے لیے کسی طرح بھی درست اور موزوں نہیں ہو سکتے ۔ شرعی قانون متعین ہے چنانچہ اس میں جمود پایا جاتا ہے ، جو جدید معاشرہ کی ضروریات اور مسائل کے حل کرنے سے عاجز ہے ۔ لہٰذا اس کو مسترد کر دینا چاہیے اور اس کو متفقہ مجموعۂ قوانین دیوانی سے بدل دینا چاہیے ۔ آقاؤں کی دیکھا دیکھی ، ان

کے مسلمان ذہنی غلاموں نے بھی یہی نعرہ بلند کرنا شروع کر دیا۔ اس قسم کے اعتراضات سے وہی لوگ متائثر ہو سکتے تھے، جو تاریخ سے نابلد ہیں اور جن بیچاروں کو یہ تک پتا نہیں کہ شرعی قانون پچھلی چودہ صدیوں سے تمام مسلم ممالک میں باقاعدہ طور پر رائج ہے اور اس میں کہیں بھی کوئی کمی یا خامی محسوس نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس اس قانون نے معاشرہ کو قوت و تاثیر بخشی اور بحرِ ظلمات سے لے کر بحرالکاہل تک صدیوں پر محیط ضروریات اور مسائل کو حل کیا۔ لہٰذا کوئی بھی صاحبِ بصیرت شخص کیسے تسلیم کر سکتا ہے کہ مسلم دنیا پر نوآبادیاتی جابروں و حاکموں کے تسلّط کے فوراً ہی بعد اسلامی قانون جامد و غیر متحرک اور ناقابلِ عمل ہو گیا۔ مانی ہوئی بات ہے کہ ایک قانون جس نے گذشتہ چودہ صدیوں سے تغیّر پذیر معاشروں کے پیش آمدہ چیلنجوں کا سامنا کرنے سے ذریغ نہیں کیا۔ وہ نہ تو آناً فاناً جامد اور غیر متحرک ہو سکتا ہے اور نہ ہی خلاء کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جہاں جہاں اسلامی قانون نافذ العمل رہا وہاں وہ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ ترقی کی منازل طے کرتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ ترقی کے ریکارڈ بھی قائم کرتا رہا۔

۲۔ بربریت کا مزاج

بربریت کی اصلاح ہی اسلام کے خلاف نوآبادیاتی طاقتوں کے ظلم و ستم، ان کی کینہ پروری اور ان کے انتقام کی پیاس کی عکاسی کرتی ہے۔ علاوہ ازیں جدید ٹیکنیکی مہارت کے حصول کے باعث، ان کے غرور اور خود پسندی نے ان کو نہ صرف مذہبیت (مذہبی اطوار) اور نفسِ مذہب کو ٹھکرا دینے پر آمادہ کیا، بلکہ یہ اعلان بھی کروایا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے خلیفہ (حضرتِ انسان) کو مردہ قرار دینے پر اکسایا۔ نوآبادیاتیوں نے ایک یا دو قوانین جن میں جرم کی نوعیت کے پیشِ نظر سزا کا سنگین ہونا عین انصاف تھا (جیسے چور کا ہاتھ کاٹنا اور محصن (شادی شدہ) زانی / محصنہ زانیہ کو سنگسار کرنا وغیرہ ایسے سنگین جرائم کی سزاؤں کو بنیاد بنا کر سارے شرعی قانون کو نکال باہر کیا اور وہ اس نام نہاد کارنامہ پر اپنے آپ کو رحم دل، شریف النفس اور ہمدرد گردانتے ہیں۔ حالانکہ دو عالمی جنگوں میں ان کی بہیمیت اور وحشیانہ

ین ، موجودہ دور میں ان کی جانب سے بنی نوعِ انسان کا قتلِ عام اور ان کی عدیم المثال اور وسیع پیمانے پر سفاکیوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے ۔ جن کا ارتکاب تاریخ کے تاریک ترین دور میں بھی نہیں کیا گیا ۔ اُلٹا دعویٰ یہ ہے کہ آج کا مہذّب انسان سنگسار کرنے اور ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دے سکتا ۔ حالانکہ وہی مہذّب انسان جوہری اسلحہ خانوں اور مہلک ہتھیاروں سے ساری انسانیت کو بھسم کر دینے پر آمادہ ہے اور اس "مہذبانہ" سلوک کے تاریخی شواہد بھی موجود ہیں ، مثلاً دوسری جنگِ عظیم میں انسانوں کو زندہ جلا دیا گیا اور ان کے مردہ جسموں کے پگھلنے سے جو چربی بہ نکلی تھی ، اس سے صابن کی ٹکیاں بنائی گئیں ۔ جبکہ موجودہ دور میں حریّت پسند اور آزادی کے حیالے غدارانِ وطن سے موسوم ہیں اور الٹا غداروں کو مہذّب لوگ قرار دیا جاتا ہے ۔ نیز موجودہ روشن خیال تہذیب میں خونی عشل جھوٹے مقدمات اور قیدیوں کے کیمپوں کے جمگھٹوں کو مہذّب کارروائیاں تصوّر کیا جاتا ہے ۔ پروفیسر ای ۔ ایف ۔ ایم ۔ ڈربن اپنی کتاب "جمہوری اشتراکیّت کی سیاست" (سنِ اشاعت ۱۹۸۶ م ، ص ۔ ۲۵) میں نوحہ کناں ہے کہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں انسانیت سوز مظالم اور وحشیانہ سلوک کو روا رکھا گیا ہے ۔ وہ اپنے خیالات اور تاثرات کو حسبِ ذیل انداز و الفاظ میں ختم کرتا ہے :

"میں بڑی انکساری سے یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ دنیا کی سابقہ تاریخ میں اس قسم کی وسیع پیمانے پر سفاکی کا شائد ہی کوئی ثبوت ہو" (۳۵)

فی الاصل موجودہ ڈرگ مافیا ثقافت اور ایڈز زدہ تہذیب نے بنی نوعِ انسان کو قعرِ مذلّت میں جھونک دیا ہے ۔ جرائم کی کثرت جیسے بدکاری ، نشہ ، زنا ، چوری اور ڈاکہ زنی معاشرہ کی اقدار اور اطوار بن چکی ہیں ۔ اس کے برعکس ، اسلامی معاشرہ ایسی صورتحال پیدا کرتا ہے جس میں جرائم اور کبائر کے ارتکاب کی روک تھام ضروری ہو جاتی ہے ۔

فرقہ واریت اور گروہ بندی

یہ الزام دیا جاتا ہے چونکہ ایک یونیورسل اور عالمگیر اسلامی مجموعۂ قوانین کو مرتب نہیں کیا

جاسکتا، جو اسلامی قانون کے تمام مکاتبِ فکر کے لیے قابلِ قبول بھی ہو، چنانچہ ایسا اسلامی قانون عام طور پر درست اور موزوں بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ اعتراض تمام تر جہالت اور لاعلمی پر مبنی ہے، کیونکہ امتِ مسلمہ کے تمام مکاتبِ فقہ شریعت کی حدود و قیود، اس کی مبادیات و کلّیات ـــ اور ناقابلِ تغیر احکامات پر متفق ہیں۔ نیز شریعت کے اصول و مبادی کے بارے میں کبھی بھی کسی قسم کی اختلافی رائے پیش نہیں کی گئی۔ البتہ اختلاف صرف جزئیات اور فروعات تک محدود رہا، جیسے وہ قوانین جنہیں تشریح و استنباط کے ذریعے وضع کیا گیا تھا۔ وہ بھی اجماعی صورت (چوٹی کے علماء و فقہاء کی متفقہ رائے) اور جمہورِ علماء (اکثریت کی حمایت جو اصولِ فقہ کی اصطلاح میں متفق علیہ کے نام سے موسوم اور مشہور ہے) کی منظوری کے بغیر کبھی بھی قانونی قوت اور تاثیر حاصل نہیں کر سکے۔

خوف زدہ اور غیر محفوظ غیر مسلم اقلیتیں

ایک اور مسئلہ جسے اسلامی قانون کے نقادوں نے بڑا اہم قرار دیا ہے، وہ غیر مسلم اقلیتوں کا معاملہ ہے۔ چونکہ شخصی قانون اور ملکی قانون کے مابین فرق ہوتا ہے، چنانچہ ایک اسلامی ریاست میں تمام غیر مسلم اقلیتیں اپنے اپنے شخصی قوانین پر عمل پیرا اور پابند رہتی ہیں۔ اس واسطے اسلامی قانون اور تمام غیر مسلم اقوام کے شخصی قوانین کا آپس میں تصادم نہیں ہوتا۔ جہاں تک ملکی قوانین کا معاملہ ہے، بلا شبہ اکثریت حسبِ خواہش قوانین کو نافذ کرنے کا حق رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ جدید پارلیمانی حکمرانی میں بھی، حزبِ اقتدار اپنی مرضی کی قانون سازی کرتی ہے، اگرچہ حزبِ اختلاف ایوانِ نمائندگان میں خواہ کتنا ہی سخت اصرار اور سرگرم احتجاج کرے۔ اگر یہ فعل اور عمل منطقیانہ ہے تو کسی مسلمان ملک میں اسلامی قانون کا نفاذ کیونکر غیر منطقی، غیر انسانی، غیر مہذب اور ناشائستہ ہوگا؟ لہذا امتیازی سلوک روا رکھنا اور جداگانہ قانون نافذ کرنا بھی قطعًا قرینِ انصاف ہے۔

اسلامی قانون سے نفرت و عداوت

یہ حوالہ بھی بڑا معتبر ہے کہ آخر وجہ کیا ہے کہ جب بھی اسلامی قانون نافذ ہوتا ہے تو نئے نو آبادیاتی اور مغربی ابلاغِ عامہ تقاضا کہ جذباتی ردِعمل ظاہر کرتے ہیں۔ اس کی صاف وجہ یہ ہے کہ مغربی ذہن کو قانون اور مذہب دونوں کا اشتراک گوارا نہیں ہے، کیونکہ حکومت کی جانب سے چرچ کا انتظام اور حکومت و چرچ کے مابین جدائی اور علیحدگی کو مسلمہ امر سمجھ لیا گیا ہے۔

اسی لیے ایک دفعہ پاک پیغمبر حضرت عیسٰی علیہ السّلام نے فرمایا کہ:

"شہنشاہِ وقت جن امور کا تمہیں حکم دے، ان سب کو بجا لاؤ۔"

بدقسمتی سے اس مقولے کو دینی و دنیوی تفریق کے معنی میں لے لیا گیا، بنابریں سیاسی، سماجی اور معاشی معاملات ایسے لادین اور مادہ پرست حاکموں کو سونپ دیے گئے، جو رومن قانون یا قیصر کی حاکمیت کے ہم پلہ بن بیٹھے۔ مسیحیت کی رو سے چرچ کے قانون سے مراد وہ قوانین ہیں، جو کیتھولک اور ایپسکوپل (Episcopal-پادریوں کا راج) چرچوں کی پادری تنظیم کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اس طرح مغربی عیسائیت میں قانون ہمیشہ بشری اور وضعی ہی رہا، جس میں ضرورت کے مطابق قانون سازی، ردّوبدل اور نظرِثانی کی گئی۔ پس عیسائی ذہن نہ تو غیر متغیر خدائی قوانین کا تصوّر کرسکتا ہے اور نہ ہی وہ قانون اور الہیات کا اشتراک تسلیم کرسکتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام نے نہ تو قیصرِ روم کو وہ اختیارات تفویض کیے، جنہیں وہ اپنے شایانِ شان تصوّر کرتا تھا۔ اور نہ ہی اسلام نے قیصری نظریۂ سیاست کی توثیق کی۔ دراصل اسلام حکومت کی جانب سے چرچ کے انتظام کے خلاف ایک سراپا احتجاج ثابت ہوا۔ چنانچہ ہر انسان پر مرضیِ مولٰی کے آگے گردن جھکائے رکھنا ہی واجب ٹھہرا۔ عام طور پر اسلام کو جیسا تصوّر کیا جاتا ہے یہ ویسا نہیں ہے، یعنی پرانی و فرسودہ رسومات کا پلندہ۔ حالانکہ یہ کائناتی و عالمی نظام ہے یعنی ایک طرزِ زندگی، ایک سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی

نظام ۔ فرد اور معاشرہ دونوں کی چھچھوری حرکات اور بچگانہ خواہشات کی تسکین کے لیے اس کو بدلا نہیں جا سکتا ۔ بلکہ یہ دونوں ، فرد اور معاشرہ ، ہی تو ہیں جن کی تعلیماتِ وحی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے اصلاح کی ضرورت ہے ۔

شریعت یعنی اسلامی قانون معاشرے پر مقدّم ہے اور معاشرہ اس قانون کا تابع ۔ علم الصرف کی رو سے ، لفظِ " شریعۃ " عربی مصدر سے مشتق و ماخوذ ہے جس کے معنی شاہراہ کے ہیں یعنی ایسی راہ جو سیدھی اللہ تعالیٰ کی طرف لے جاتی ہے اور ایک آئیڈیل قانون ہی ایک مثالی معاشرہ کی تشکیل کر سکتا ہے ۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے ، قانون ، وحیِ الٰہی کا جزو لاینفک اور تمام احکامِ خداوندی پر محیط ہے ۔ یہ امتِ مسلمہ کو قانونِ الٰہی (جو ابدی اور لاثانی ہے) کے مطابق امن و سکون سے زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور یہ قانونِ الٰہی شریعت کے نام سے موسوم ہے ۔

برّ اعظم یورپ کا قانون رومن لاء کے نقطۂ نظر کی ترجمانی ہے ۔ حالانکہ اسلامی قانون تنزیلٌ من اللہ ہے ۔ اوّل الذکر قانون اپنی زیادہ تر مستند تعبیرات کے لیے جسٹنانی قانون کا جزبہ و چیستان ہے ۔ جبکہ جسٹانی قانون عہدِ انطونیہ کے قابلِ ذکر قانون دانوں کی آرا اور تعبیرات پر مبنی ہے ۔ اصلاً رومن قانون انسانوں کا وضع کردہ قانون ہے اور انسانوں کے عمل پیرا ہونے کے لیے ہے ۔ چنانچہ اسے تبدیل شدہ قانون کہنا درست ہوگا ۔ دیوانی قانون کا حصّہ دار ہوتے ہوئے مغربی قانون زیادہ تر رومن قانون سے ماخوذ تھا اور اس کو بادشاہ یا مقنّنہ (مجلسِ قانون ساز) نے نافذ کیا تھا ۔ اس طرح یہ ایک انسان کا وضع کردہ اور لادینی قانون قرار پایا اور جنہوں نے اسے وضع کیا اور نافذ کیا تھا ، وہ اسے بآسانی تبدیل کر سکتے تھے ۔ اس کے برعکس ، اسلامی قانون کا اصل ماخذ وحیِ الٰہی (قرآن مجید) اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے ۔ جبکہ انسان وحیِ الٰہی (اسلام) کا محتاج ہے اور یہ حیاتِ انسانی کے متفرق پہلوؤں اور متعدد گوشوں کے بارے میں سیر حاصل بحث کرتا ہے ۔ نیز یہ زندگی کے دونوں پہلوؤں ظاہر و باطن اور قومی و بین الاقوامی تعلقات کا احاطہ بھی کرتا ہے ۔ جبکہ مغربی مکاتبِ فکر کا قانون ، جیسے معاشرتی مکتبۂ قانون ، جو قانون اور معاشرہ کے باہمی تعلقات اور اثر رسوخ

سے بحث کرتا ہے ۔ اور مکتبۂ فطری قانون ، جو اشیاء کی فطری ماہیت میں حصہ دار ہونے والے قانون کی حمایت کرتا ہے اور انسانی عقل بطور فطری انصاف کے اس کی طالب بھی ہے ، وغیرہ وغیرہ ، قوانین شرعیہ کے ہاں ناپسندیدہ اور ناقابلِ قبول ہیں کیونکہ وحی الٰہی نے نیکی اور بدی ، اچھائی اور بُرائی (خیر و شر) کو بالکل واضح کر دیا ہے ۔ نیز اشاعرہ اور معتزلہ نے ان مسائل کے بارے میں سیر حاصل بحث کی ہے اور استدلالات پیش کئے ہیں ، جو ہمیں یہاں تک محدود نہیں رکھنا چاہتے ۔ اللہ تعالیٰ انسان کو اچھائی کرنے کا حکم دیتا ہے اور اس کو بُرائی کرنے سے روکتا ہے ، چنانچہ اللہ تعالیٰ کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ اس کے بندے اس کے احکام کے بارے میں کس قدر اور کتنے سنجیدہ ہیں ۔ بنا بریں جُوا ، سُود ، شراب نوشی وغیرہ انسانی عقل کے لیے دلکش اور دلفریب ہیں ۔ لیکن اسلامی قانون نے ان سے منع کیا ہے ۔ اس لیے فقہ کے مسالکِ اربعہ (احناف ، موالکی ، شوافع اور حنابلہ) نے شرعی قانون کی تدوین کی اور قیاس (علت و حکمت سے احکام کا ثبوت) اور اجماع (فقہاء کی اکثریت کا اتفاق رائے) کے نظریات کو وجود بخشا ، جن کو اسلامی قانون کے ابتدائی ماخذوں میں شامل کر دیا گیا ۔ بعد ازاں ان دونوں نے بھی قانون کے ذیلی اور ضمنی سرچشموں کی ترویج کی اور انھیں ترقی دی ۔

اصلاحی تحریکات

اسلام کے فقہی اصول جو گذشتہ چودہ صدیوں سے مکمل طور پر کامیاب رہے اور بہتر انداز سے مؤثر رہے ، وہ نوآبادیاتی دورِ حکمرانی میں اصلاح اور ردو بدل کے شکار ہوئے گذشتہ دو صدیوں میں بالخصوص ۱۸۵۰ء کے بعد ، اسلامی قانون کی تغریب (اسلامی قانون کی مغربی تشکیل) کی کارروائی تیزی اختیار کر گئی ، جب مغرب کی ثقافتی اور سیاسی یلغار کے تحت اوّلین بنیادی تبدیلی ، شرعی عدالتوں کے ساتھ ساتھ لادینی عدالتوں کے قیام کی صورت میں شروع کی گئی ۔

سلطنتِ عثمانیہ نے بے شمار قوانین نافذ کیے تھے ، جیسے قوانینِ تجارت (۱۸۵۰ء) ،

قوانین تعزیرات (۱۸۵۸ء)، تجارتی قواعد وضوابط کا مجموعہ (۱۸۶۱ء)، اور بحری تجارت کے قوانین (۱۸۶۳ء)۔ یہ سب قوانین یورپی قوانین کے مثل و مانند تھے بالخصوص فرانسیسی طرز پر۔ قوانین متذکرہ بالا، باوجودیکہ وہ شریعت کی روح کے منافی تھے، پھر بھی وہ قوانین شرعیہ کے ہمسر اور برابر رہے۔ علاوہ ازیں تنظیمی اصلاحات نے لادینی عدالتوں کے قیام کا مشاہدہ کیا، درآنحالیکہ شرعی عدالتیں مسلم آبادی کے احوال شخصیہ کے مقدمات تک محدود کر دی گئی تھیں اور ۱۸۷۵ء میں مصر میں ملی جلی اور مخلوط عدالتیں قائم کی گئیں اور ساتھ ساتھ دیوانی قوانین بھی نافذ کیے گئے تاکہ یہ عدالتیں ان کو استعمال میں لاسکیں۔ ان عدالتوں نے نپولین کے قوانین کو وسیع پیمانے پر اپنا کر یہ خاکہ کھینچا اور یہ سب کچھ انتظامی مستعدی، قومی ترقی اور بیرونی وخارجی رجحانات کی تسکین کے نام پر کیا گیا تھا۔ اس تبدیلی کی طرف داری میں سیاسی، قانونی، سماجی، معاشی اور ثقافتی دلائل بھی پیش کیے گئے تھے۔ لہذا اس انداز سے ناقابل تنسیخ اور غیر متغیر شرعی قوانین کو ہٹانے اور علیحدہ کرنے کے لیے زمین ہموار کی گئی اور بہت سارے شرعی قوانین کو مغربی قوانین جیسے تجارتی، فوجداری اور دیوانی قوانین سے بدل دیا گیا۔ نیز شرعی قوانین میں ترمیم اور نظر ثانی کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ یوں دوہری قانونی اسکیم اپنے اختتام کو پہنچی۔

لادینی و مادی قوانین کو دینی قوانین کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا تھا۔ تجارتی اور تعزیری قوانین کو زیادہ تر مغربی طرز میں رنگ دیا گیا اور قانون معاہدہ اور قانون ٹارٹ (فعل بےجا، جنایت اور کجروی) کو جدید بنایا گیا۔ نیز احکام کے جداگانہ انتخاب کا آغاز کیا گیا اور شخصی قانون کی تدوین کی اساس صرف حنفی فقہ طے نہ پائی، بلکہ اہل السنت والجماعت کے چاروں مسالک فقہ سے ماخوذ چیدہ چیدہ قوانین پر تکیہ کیا گیا۔ نوبت بایں جا رسید کہ مصر، شام، عراق، فلسطین، ٹیونس، نائیجیریا اور مراکش کے مصلحین بھی یورپین قانون دانوں کی سُر الاپنے لگے۔ اسلامی قوانین ازدواج و طلاق مکمل طور پر تختۂ مشق بنے اور طلاق کے اصولوں کو یکسر بدل دیا گیا۔ اور مختلف کمیٹیاں تشکیل دی گئیں، جن کو مسلم شخصی قوانین (بالخصوص قانون وقف اور قانون وراثت) سے متعلق جامع و مکمل مجموعہ ہائے قوانین مدوّن کرنے کی ذمہ داری سونپی

گئی۔ پس انہوں نے ایک جامع مجموعۂ قوانین تیار کیا اور ساتھ ساتھ شرعی عدالتوں کو قدیم فقہی کتابوں سے بھی رجوع کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی اور مخلوط عدالتوں کو ختم کرنے کے لیے دیوانی قوانین بھی نافذ کئے گئے۔ اس طرح تمام مشرقِ وسطیٰ میں اسی قسم کی بنیادی اصلاحات انجام پائیں۔ مذکورہ بالا تجدیدِ قوانین کی تقلید میں، جدید مجموعہ ہائے منتخب قوانین (مذاہبِ اربعہ کے احکام کا اشتراک) برائے شخصی معاملات متعارف کرائے گئے۔ تو اس طرح شرعی عدالتیں قومی عدالتوں کے دائرہ اختیار میں آکر یکجا و یکساں ہو گئیں۔

اصلاحات کے جنون و جوش میں آکر، انقلابی متشدّدین غیر متغیر قوانین میں گستاخانہ دخل اندازی کے مرتکب ہوئے اور انہوں نے انیسوی صدی کے اختتام تک شرعی قوانین کو مغربی قوانین کے قالب میں ڈھالنے کی انتھک کوشش کی۔ نتیجتاً دیوانی قانون نے اسلامی قانون کے دائرہ اختیار اور دائرہ عمل کو محدود کر دیا۔ مزید برآں مختلف مسلم ممالک میں شرعی عدالتوں کو یکسر ختم کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ قومی عدالتیں شخصی معاملات کے بارے میں فیصلے صادر کرنے لگیں۔ تاہم شرعی عدالت (قاضی عدالت) کو ازدواجی مقدمات نپٹانے کے لیے قومی عدالتوں کی معاولت و برابری دی گئی۔ عہدِ عثمانیہ میں ۱۹۱۷ء تک یہود و نصاریٰ کے مقدمات کا فیصلہ ان کے مذہبی قوانین کے مطابق صادر کیا جاتا تھا، لیکن قطع نظر عقیدہ و مذہب کے، سب قوموں کے لیے متحدہ قوانین کی تحریک نے شخصی معاملات کے بارے میں جداگانہ فیصلوں کے تصوّر کو زک پہنچائی۔

بہرصورت تمام مذہبی فرقوں کے لیے ازدواج و طلاق کے مشترکہ قانون کے حصول کی خاطر شرعی قوانین میں ایک طرح کی خلل اندازی رونما ہوئی۔ بس یہی وجہ ہے کہ شخصی قوانین میں اصلاح و ترمیم کا تدریجی عمل ابھی تک اپنے اختتام کو نہیں پہنچا۔

نصوص شرعیہ میں بعض مصنوعی متنازعہ فیہ مسائل کا بطور اصل استعمال

تشریع اسلامی کے نقاد اس کی نصوص میں سے بعض متنازعہ فیہ مسائل کو بطور اصل استعمال کے پیش کر رہے ہیں۔ جن کو انہوں نے اسلامی تہذیب کے جامع نظام سے الگ

اور علیحدہ کر دیا ہے۔ جابرانہ گنے چنے احکام کی مسخ شدہ تصویر کشی یہ تأثر دیتی ہے کہ اسلامی ثقافتی شعور اور اس کے قانونی فلسفے ان اکا دکا فرسودہ احکام تک محدود ہیں اور اسلام بحیثیت قانونی و تصوراتی مذہب ہونے کے باوجود چند سزاؤں جیسے چوری کرنے پر ہاتھ کاٹنا اور زنا کے ارتکاب پر سنگسار کرنا، کے علاوہ کچھ بھی تو نہیں۔ جبکہ یہ تعددِ ازدواج کی بھرپور حمایت کرتا ہے اور غلامی کو ترویج دیتا ہے اور یہ قانون کے ضمن میں منطقی استدلال اور اس کی معقول تعبیر کی ہمت افزائی نہیں کرتا اور یہ فقہ کے مسالکِ اربعہ کی تقلید و پیروی کا پرچار کرتا ہے اور اجتہاد (یعنی ذاتی رائے اور فقیہانہ قیاس) کی اجازت نہیں دیتا۔ جیسا کہ اس کے بارے میں پہلے بھی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ لہٰذا اس قسم کے اعتراضات پوری توجہ کے مستحق ہیں۔ حالانکہ کسی بھی مذہب کے کسی قسم کے قانونی نظام کا ایک ایماندار اور غیر جانبدار نقاد اس کے مذہبی نظریات کو قانونی پہلوؤں سے جدا کرنا گوارا نہ کرے گا۔ پہلے یہ تذکرہ آ چکا ہے کہ اسلام حکومت کی جانب سے چرچ کا انتظام یا چرچ اور ریاست کے مابین تفریق یا روحانی اور دنیاوی زندگی کے درمیان فرق کو رد کرتا ہے۔" احکامِ خداوندی کو خلوص اور حسنِ نیت سے بجا لاؤ اور قیصر کے حقوق کی بھی مکمل پاسداری کرو" والا مقولہ اسلام سے قطعاً بے جوڑ ہے اور عہدِ حاضر میں اُخروی اور دنیوی زندگی کا دوہرا پن ہی انسان کی انتہائی بے راہ روی و بداطواری اور بڑھتے ہوئے جرائم کی کثیر ہولناکیوں کا ذمہ دار ہے۔ اسلام آفاقی تہذیب ہونے کی بنا پر وحی سے فیضیاب ہوتا اور نورِ الٰہی سے سرفراز ہوتا ہے۔ چنانچہ انتہائی لازمی امر ہے کہ شریعت اسلامیہ کے قوانین تعزیرات (حدود و عقوبات) کی اصل اصیل، تعددِ ازدواج اور غلامی وغیرہ کے تصورات و نظریات کو جانچا اور پرکھا جائے۔

اسلامی مجموعۂ تعزیرات

اسلامی سماجی معاشرت کی بنیاد ورع و تقویٰ، عفت و پاکبازی، اور نیک نہاد و امورِ خیر پر ہے۔ جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے انکی وضاحت فرمائی ہے۔ اسی طرح سزاؤں کا قانون اور دیگر احکاماتِ شرعیہ فطری سماج کے فہم و ادراک

سے ہم آہنگ ہیں ۔ شریعت کے ایک یا دو احکام کو کامل ساخت سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا اور ان متنازعہ فیہ مسائل کو بطورِ حوالۂ اصل واساس کے استعمال نہیں کیا جاسکتا ۔

شومیٔ قسمت سے بعض نقاد بالخصوص اسلام دشمن ، ذرائع ابلاغِ عامہ اِدھر اُدھر سے جزوی اور الگ تھلگ قوانین واحکام کو چھانٹ لیتے ہیں اور ان پر بربریت اور جہالت کا لیبل چسپاں کر دیتے ہیں ۔ وہ یہ کارنامہ صرف اس لیے سرانجام دیتے ہیں کہ ان کی خواہش کے مطابق اسلامی قوانین مغربی قوانین کے نقطۂ نظر سے مطابقت ومفاہمت نہیں رکھتے ، مثلاً کسی چور کا ہاتھ کاٹنا یا زانیوں کو سنگسار[1] کرنا دونوں مسائل کو بطور اصل پیش کرتے ہوئے یہ تاثر دیا جاتا رہا ہے کہ اسلامی قانون ماسوائے ان دو شدید اور سخت ترین سزاؤں کے کچھ بھی تو نہیں ۔ حالانکہ دشواری یہ ہے کہ وہ یہ سمجھنے اور سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ آخر اسلام نے کب اور کن حالات میں ہاتھ کاٹنے کی اجازت دی ہے ؟ یہ ہر کوئی جانتا ہے کہ ہر اسلامی ریاست زندگی کی تمام بنیادی ضروریات کی ضمانت دیتی ہے اور سرکاری خزانہ (بیت المال) غریب ، ضرورت مند ، بیمار اور محتاج وبے کس کی اس حد تک اور بڑے اہتمام سے مالی امداد اور معاشی اعانت کرتا ہے کہ کوئی شخص بھوکا نہ سوئے ، کوئی بیمار بغیر علاج ومعالجہ کے پڑا نہ رہے اور کوئی بھی محتاج بے یار ومددگار نہ رہے ۔ چنانچہ اسلام ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے ، جس میں کوئی بھی فرد حالات سے مجبور ہو کر چوری چکاری نہ کرے ۔ لہٰذا ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس کی تمام تر بنیادی ضروریات حکومت پوری کر رہی ہو ، اس میں کوئی فرد کیونکر چوری کرے گا ؟ بالفرض کوئی چوری کا واقعہ در پیش آتا ہے تو سب سے پہلے سرکاری اہل کار ، واحلہ اور مالیات کے ادارے اصحابِ حل وعقد کے سامنے جواب دہ ہوں گے ۔ کیا چوری کرنے والے شخص کو زندگی کی تمام بنیادی ضروریات فراہم نہیں کی گئیں تھیں ؟ اثبات کی صورت میں ، چور نہ صرف سخت سزا کا مستحق ومستوجب قرار پاتا ہے ، بلکہ ایسی رفاہی اور فیض رساں مملکت

---

[1] مسیحیت اور یہودیت کے تحت سنگساری کی سزا عقوبات کا لازمی حصہ تھی ، جسکو قرونِ وسطیٰ میں تبدیل کر دیا گیا تھا ۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ، سنِ اشاعت ۱۹۸۶ م ، جلد نمبر ۱۶ ، صفحہ نمبر ۸۶۰) ۔

کی جانب سے جلاوطن کیئے جانے کا سزاوار ہے۔ کیونکہ اس کو زندگی کی ساری ضروریات و سہولیات میسر تھیں۔ لہٰذا اس قسم کے مجرم کو اس ریاست میں سکونت اختیار کرنے کا قطعاً کوئی حق حاصل نہیں ہے جس سے وہ ایسے پاکیزہ معاشرہ اور تقویٰ شعار سوسائٹی کو گندہ و آلودہ کرے۔ کیونکہ اس قسم کی آئیڈیل ریاست، جس کی تاسیس میں عدل واحسان کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔ اس قماش کے شہریوں کے لیئے نامناسب اور ناموزوں ہے۔

موجودہ مسلم ممالک میں جہاں نہ تو حقیقی معنوں میں اسلامی ریاست کا وجود ہے اور نہ ہی کمزور وناتواں کے ساتھ انصاف سے پیش آیا جاتا ہے، اسلام کے قوانین تعزیرات کو نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ آج کل کی مسلم ریاستیں اپنی اصل اور ہئیت کے اعتبار سے غیر مسلم ریاستوں سے مختلف نہیں ہیں۔ جہاں اجارہ داری، سودخواری اور مظالم و استحصال کو فضل گردانا جاتا ہے اور وہاں صرف مراعات یافتہ طبقہ ترقی پاتا ہے اور محروم لوگ صدمۂ جانکاہ کا شکار ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کو اپنے بنیادی حقوق سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں اور ان معاشروں میں معدودے چند حضرات ہی بہتیروں کی تباہی کے باعث متمول و مالدار بنتے ہیں۔ کیا اس قسم کی بگڑی ہوئی اور خراب سوسائٹی، جہاں غریب آدمی کو انصاف نہیں ملتا اور کمزور کو سنگدلانہ رسوائی اور بے رحمانہ حقارت سے روندا جاتا ہے، میں ایک چور کو اسلامی سزادی جاسکتی ہے؟ تو چور کا ہاتھ کاٹنا — چہ معنیٰ دارد؟ چنانچہ اس قسم کے معاشرہ میں جہاں مسلم اور غیر مسلم، غرضیکہ سب ہی لوگ حالات سے مجبور ہو کر چوری کرنے لگ جائیں، تو وہاں اسلامی تعزیراتی قوانین کو نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ مجموعۂ تعزیراتِ قوانین کو صرف خالص اسلامی معاشرہ میں ہی نافذ کیا جاسکتا ہے، جہاں جرم کے اسباب کا انسداد ہوچکا ہو (یا جرم کرنے کے لیئے تمام دروازے بند کر دیئے گئے ہوں) اور کوئی فرد بھی حالات سے مجبور ہو کر چوری نہ کرے۔

بدکاری اور زنا کی سزا میں کوئی فرق نہیں ہے، یہ سزا صرف اور صرف ایک ایسی اسلامی سوسائٹی میں ہی نافذ کی جاسکتی ہے۔ جہاں خدا سے ڈرنے والے موجود ہوں، جو اس کی رضا کے طالب ہوں اور جو پاکبازی اور پارسائی کا پرچار کریں۔ ان جرائم کو گناہ خیال کریں اور انکو احکام خداوندی کی خلاف ورزی جانیں اور ان کو دل لگی تصور نہ کریں، جیسا کہ جدید سوسائٹی کا رجحان ہے،

جہاں جنس لوگوں کی تقدیر پر حکمران و نگران ہوتی ہے اور جہاں غازہ و معطر اور ناز و نخرے والی عورتیں، کرائے والی لڑکیاں (کال گرلز)، دل بہلانے والی حسینائیں اور ناچ کرنے والی دوشیزائیں اور طوائفیں اعلیٰ رتبہ حاصل کر لیتی ہیں اور جس معاشرہ میں عریانی اور برہنگی انتہا کو پہنچ چکی ہو اور فحش جنسی لٹریچر عام ہو اور جہاں ذرائع ابلاغ عامہ یعنی ٹیلی ویژن، ریڈیو اور پریس شہوانی بھوک کو بھڑکانے، سوسائٹی کی تمام سطحوں پر اختلاط اور گڑبڑ وار تعاش کی ہمت افزائی کرنے اور بڑھانے میں مصروف پیکار ہوں اور اس میں آزادانہ جنسی تعلقات بغیر شادی بیاہ کے، ناپختہ جنس پرستی، عارضی و آزمائشی شادی، سوسائٹی گرلز اور ہم جنس پرستی (خواہ لواطت کی صورت میں ہو یا ایک صنفِ نازک کا دوسری صنفِ نازک سے جسمانی و عضویاتی ملاپ) جنسی تلذذ اور شکار کی تلاش کی غرض سے گلیوں میں ہٹر گشت کر رہی ہوں۔ حد یہ ہے کہ زنا کی ہمت افزائی کرتے کرتے سوسائٹی نے اجتماعی طور پر جدید تہذیب کے سماجی اور اخلاقی تانے بانے کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ ایک اطلاع یہ ہے کہ صرف پیرس میں پچاس ہزار (عورتیں) کل وقتی پیشہ ور طوائفیں ہیں اور جنہوں نے اپنی ایک کاروباری یونین بنا رکھی ہے۔ جب بدکاری تجارت اور ایک قسم کا پیشہ بن جائے جیسا کہ عہدِ قدیم میں جاہل و گنوار معاشرہ اس لعنت اور وبا میں جکڑا ہوا تھا، تو ایک پارسا و پاکیزہ معاشرہ کیسے نافذ العمل بنایا جا سکتا ہے؟ پس اس قسم کی گندی سوسائٹی کے بارے میں درستگی اور اصلاح کی امید رکھنا فضول اور عبث ہے۔ جہاں اخلاقی قدروں کا جنازہ اُٹھ چکا ہو اور اعلیٰ قدریں پامال ہو چکی ہوں، جہاں بدی اور برائی کا تصور مٹ چکا ہو اور برہنگی عام دل لگی اور تفریح طبع کا سامان بن چکی ہو۔ جہاں ایڈز کے جراثیم (عالمگیر مہلک بیماری) تیزی سے پھیل رہے ہوں اور کسی قدر اور کسی قسم کی قانون سازی اور تدبیر برائے حفظانِ صحت ان جراثیم کے پھیلاؤ کے لیے مانع اور سدِ راہ نہ بن سکیں۔ بالفاظِ دیگر، بنی نوعِ انسان کو درندہ بنانے کی ترکیب اور چال سرعتِ رفتار سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جتنے زیادہ قانون اتنے ہی زیادہ جرم روزمرہ رونما ہو رہے ہیں۔ لہٰذا ان سب کے نتائج پاگل پن اور دیوانگی، اجڑے ہوئے اور غیر آباد گھر اور منشیات کی وبا کی صورتوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ تاہم بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ فی زمانہ کوئی ایک بھی مسلمان ملک موجود نہیں، جو

ان تمام قسم کے جرائم سے پاک وصاف ہو۔

جدید علم الجرائم اور اسلامی فلسفۂ تعزیرات

یہ سوال بہتیرے قانونی ماہرین کے ذہن ودماغ میں کھٹک رہا ہے کہ آج کی دنیا میں جرائم کیوں تیزی سے پھیل رہے ہیں، جبکہ دنیا یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس نے تہذیب و ثقافت کی بلندیوں کو چھو لیا ہے۔ جرائم کے مختلف انسدادی نظریات کی ترقی کے باوجود ماہرین علم الجرائم اور ماہرین علم التعزیرات (سزاؤں اور سزاگاہوں کے انتظام کے ماہرین) جو مجرموں کے وطیرے اور رویّے کے مطالعہ، مختلف وجوہات کی بنا پر سزا اور جرم کی تحقیقات میں مصروف پیکار رہتے، کی جرائم کے خلاف انتھک کوششیں اور ان کو کنٹرول میں لانے کی کارروائیاں بھی ناکام اور ناکارہ ہوچکی ہیں۔ ان کی بے بسی اور اس کا میکانکی قانونی نظام برائے انسدادِ جرائم دونوں نے ہمیں یہ باور کرایا ہے کہ آج کے دور میں جبکہ معاشرہ جرائم کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ کوئی بھی قانونی فلسفہ پختہ احساس اور باطنی شعور کی موجودگی کے بغیر جرائم کے خاتمہ اور ان کی بیخ کنی سے قاصر ہے۔

چونکہ جدید تہذیب میں جرم وسزا کا بنیادی تصوّر تبدیل ہوچکا ہے، چنانچہ اس تبدیلی کا نتیجہ تباہ کن ہے اور جرم کو افرادِ معاشرہ یا حکومت کے خلاف محض ایک جنایت تصوّر کیا جارہا ہے۔ لہٰذا یہ تصوّر حکومت یا قانونی عدالتوں کی جانب سے قابلِ مواخذہ ہے۔ مگر ان کے ہاں یہ جرائم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے باوجود گناہ نہیں ہیں۔

نیز اس قسم کے گناہ حکومت یا عدالتِ قانون کے دائرہ سماعت واختیار سے خارج ہیں۔ پس انسان کے وضع کردہ قوانین نے الہامی قانون سے انحراف کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ مجرموں کی نفسیات پر ان قوانین کی گرفت ڈھیلی ہوگئی ہے، جبکہ شرعی قانون تمام جرائم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے خلاف ایک دست اندازی تصوّر کرتا ہے۔ چنانچہ گناہ کا تصوّر ہی اسلام کے فلسفۂ سزا کا مرکز ومحور ہے۔ حالانکہ قانونِ شرعیہ کے نقّاد اس کو قدیم وفرسودہ، وحشیانہ اور بے رحم اور انتہائی تلخ گردانتے ہیں۔ لیکن اسلامی قانون کا عیسائی قوانین

کے ساتھ ایک تقابلی مطالعہ ہی ہمیں آسانی باور کراسکتا ہے کہ مسیحی قوانین اسلامی قانون کی بہ نسبت کہیں زیادہ تند و تلخ ہیں۔

معارفِ مذہب و اخلاقیات (جلد نمبر ۴۔ سنِ اشاعت ۱۹۱۱ء) نے جرم و سزا کے عنوان کے تحت (صفحات ۲۴۸ تا ۲۵۰، ۲۸۰ تا ۲۸۳ اور ۲۸۸ تا ۲۹۰)۔ عہدِ یہود میں چھ بڑے گروپوں کے ذیل میں جرائم کو منقسم کیا ہے اور ہر سرزد ہونے والے گناہ کے ضمن میں انجیل کی آیات کو نقل کیا ہے۔ چنانچہ وہ تقسیم حسب ذیل ہے:

۱۔ **دینی جرائم** ۔ عقائد و ایمانیات سے متعلق۔ (مقدس چیزوں کی گستاخی و بے حرمتی۔ مذمتِ دین۔ برائی و بدی، شرک و بت پرستی، غیر اللہ کے نام پر قربانی اور نذرانے، نبوت کا جھوٹا دعویٰ یا منصبِ نبوت کی خلافِ شرع (جھوٹی) ذمہ داری قبول کرنا، شعبدہ بازی و کہانت، جادوگری و سحر آفرینی، یوم السبت (ہفتہ کا دن) کی توہین اور خلاف ورزی اور مشرک اقوام کی جانب سے یہود کے خلاف جنگ و جدال)۔

۲۔ **حکومت کی خلاف ورزی** (غداری و بغاوت، رشوت ستانی و رشوت خوری اور ظلم و استبداد)۔

۳۔ **جنسی جرائم** (شہوت پرستی، عصمت فروشی اور لواطت)۔

۴۔ **مال اور ملکیت کے خلاف جارحانہ اقدامات** (ملاوٹ، اغوا، چوری اور سود خوری (اکیس ۔ ۲۲۲۵)، عصمت لٹانے پر آمادہ کرنا یا دختر کی عصمت دری)۔

۵۔ **جسم و جان پر حملے اور دھاوے** (قتل، جسمانی ضرر اور شدید ضربیں)، اور

۶۔ **رشتہ داروں پر مظالم** (والدین پر لعنت برسانا وغیرہ)۔

دینی اور دنیاوی جرائم دونوں کے بارے میں سزائیں منقول ہیں۔ (صفحہ ۲۸۰ اور ۲۸۱)۔ دینی جرائم کے عوض کفارے اور قربانیاں بطورِ تلافی مافات مقرر کئے گئے تھے، لیکن پھانسی کی سزا کو بہت سی دنیوی سزاؤں کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ مجرم کو یا تو تلوار، نیزے اور خنجر سے مار ڈالا جاتا تھا اور سر قلم کر دیا جاتا تھا۔ این۔ ٹی۔ جان کے نظریہ کے مطابق عیسائیت میں نووارد (بپٹسٹ) کی گردن اڑائی گئی اور جیمز کو تلوار سے مار ڈالا گیا۔ پھانسی دینا اور پتھر مارنا عموماً حد کے نفاذ کا طریقہ

ہے اور زندہ جلا دینا بعض دیگر جرائم کی سزا ہے۔ ان کے علاوہ شہر کی دیوار سے نیچے پھینکنا، پہیے کے نیچے دے کر مارنا، صلیب پر لٹکانا اور زندہ جلا ڈالنے کی سزائیں بھی رو بعمل آئیں تھیں موت کی سزائیں مندرجہ ذیل بارہ جرائم کے لیے عائد کی گئی تھیں :

۱ ۔ مردم کشی (قتل کرنا)
۲ ۔ بچے کی قربانی دینا (سنگسار کرنا)
۳ ۔ آدمی کو ذبح کرنا
۴ ۔ کسی خطرناک گائے یا بیل کو پالنا جو کسی دوسرے انسان کو جان سے مار ڈالے ۔
۵ ۔ تہمت کبیر کی بابت جھوٹی گواہی دینا ۔
۶ ۔ اغوا کرنا ۔
۷ ۔ والدین کی بے عزتی کرنا یا ان کو جسمانی ضرر پہنچانا (پتھر مار کر ختم کر دینا)
۸ ۔ ایسی عورت سے ہم بستر ہونا جس سے نکاح حرام ہو (اہل .... دی ۴ ۲۱۰)(زندہ جلا دینا)
۹ ۔ عصمت دری کرنا (سنگسار کرنا)
۱۰ ۔ زنا یا غیر فطری بدکاری کرنا)
۱۱ ۔ دینی پیشواؤں کی دختران کے ساتھ زنا کرنا ۔
۱۲ ۔ منگیتر سے زنا کرنا (زندہ جلا ڈالنا اور پتھر مارنا (صفحہ ۔ ۲۸۱) ۔

ہر قاری اچھی طرح جانتا ہے کہ اسلام نے موت کی سزا (حد) صرف چار جرائم کے لیے مقرر کی ہے، جو حسب ذیل ہیں :

۱ ۔ قتل، ۲ ۔ شادی شدہ کا زنا کرنا، ۳ ۔ ارتداد، اور ۴ ۔ ڈاکہ زنی اور قتل ۔ تاہم سمجھوتہ اور مصالحت کے ذریعے مقتول کے ورثاء قصاص معاف کر سکتے ہیں ۔ (سورۂ مائدہ - ۴۵)

مسیحیت کے تحت، مذہبی اور دینی جرائم کے لیے مقرر کردہ سزائیں بڑی شدید اور سخت ترین تھیں، جیسے جادوگری، مشرکانہ سحر آفرینی، مقدس چیزوں کے متعلق گستاخی کرنا اور ان کی بے حرمتی، نبوت کا جھوٹا دعویٰ، ہفتہ کے دن کی توہین وغیرہ کے بدلے سنگسار کرنا۔

موت کی سزا (حد) کے علاوہ مندرجہ ذیل سزائیں بھی مقرر کی گئیں تھیں۔

۱۔ **عضو کا کاٹ ڈالنا** (جیسے آنکھ کے بدلے آنکھ نکالنا، ہاتھ اور پاؤں کے انگوٹھے کاٹنا اور اندھا کرنا (جیسا کہ سیمسن اور زدیخہ کے معاملوں میں ایسا کیا گیا تھا)۔

۲۔ **کوڑے مارنا** (جیسے چھوٹے جرائم کی پاداش میں زیادہ سے زیادہ چالیس کوڑے مارنا مقرر کیئے گئے)۔

۳۔ **چوری کی سزا غلامی**، مجرمین کی جلاوطنی اور تشہیر و رسوائی وغیرہ رو بعمل آئین تھیں۔ انسائیکلو پیڈیا کے الفاظ میں " قدیم اسرائیل میں انجیل اور تورات کا مقرر کردہ اصل سزا کا دستور اس سے بھی کہیں زیادہ ہولناک اور ہیبت ناک تھا۔ (ایک آقا اپنی ایک لونڈی یا ایک غلام کو ان کے مرنے تک کوڑے لگا سکتا ہے)۔ (کالم۔ صفحے کا حصّہ۔ نمبر۔۲، صفحہ نمبر۔ ۲۸۱)۔

رومی اور یورپی علوم الجرائم

مسیحی علم الجرائم پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار سے رومی اور دیگر یورپی قوانین تعزیرات کا بھی جائزہ لیا جائے۔ جدید انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (جلد نمبر ۱۶، سن اشاعت۔ ۱۹۸۶ء، صفحہ نمبر ۸۶۱) مندرجہ ذیل معلومات فراہم کرتا ہے اس کے متن کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

> "سامراجی عہد روم میں چوروں اور غلاموں کو صلیب پر لٹکانا عام رائج تھا اور تاربیین پہاڑی سے زندہ آدمی کو دھکا دے کر نیچے پھینکنا سلطنت روم میں بھی ایک قسم کی سزا تھی، جیسا کہ چڑیا گھر میں وحشی جانوروں (شیر) کو دی جاتی تھی"۔

دیگر ممالک میں حد کے بارے میں انسائیکلو پیڈیا کا جاری طرز نگارش و استدلال:

> "انیسویں صدی تک جاپان میں بھی صلیب پر لٹکانے کی سزا جاری رہی۔ وسطی یورپ میں ادنیٰ قسم کے قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو صلیب پر لٹکایا گیا اور جبکہ سر قلم کرنا شرفا طبقہ کے ساتھ مخصوص تھا۔ ملحدین کو ڈائنیس جان کو زندہ جلا دیا گیا۔ انگلستان میں پھانسی پر لٹکانا، گھسیٹنا اور دوڑانے کی سزا خاص طور پر بے رحمانہ اور وحشیانہ تھی۔

اس کا طریقہ یہ تھا کہ سب سے پہلے گلہ گھونٹا جاتا تھا، اگر وہ اس سزا سے زندہ بچ جاتا تھا، تو پھر اس کو گھسیٹا جاتا اور اس سے اس کی آنتیں بھی باہر آجاتی تھیں۔ اس کی انتڑیاں تو جلا دی جاتی تھیں، لیکن اس کے جسم کو حقیقی معنوں میں چار ٹکڑوں میں کاٹ دیا جاتا تھا۔ یہ سخت سزا عموماً غداری کے جرم کے ساتھ مخصوص تھی۔ فرانس میں غدارانِ وطن کو یا تو گھوڑوں کے رسہ سے باندھ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا تھا، یا ان پر بھاری گاڑی چڑھا کر پیس دیا جاتا تھا۔ (ص - ۸۶۱)۔

انسائیکلو پیڈیا مزید باور کراتا ہے کہ:

"موت کی سزا کے علاوہ قصور واروں کے جسمانی اعضاء کو کاٹنا اور ان کے جسم پیوند اکھیڑنا عام معمول تھا، قرونِ وسطیٰ اور بالخصوص سترویں صدی میں کوڑے مارنے کے ساتھ ساتھ گرم گرم سرخ سلاخوں سے داغا جاتا تھا۔ اندھا بنا دیا جاتا تھا، اور کان، ہاتھ اور زبان کاٹی جاتی تھی۔ بسا اوقات اس قسم کی سزا کا اثر سزا یافتہ کی موت کی صورت میں رونما ہوتا تھا، قصور وار کو سزا کے شکنجہ یا سزا کی مشین میں جکڑ دیا جاتا تھا تاکہ ہجوم اس کو ٹھیک طرح سے پتھر مار سکے اور وہ زخموں سے پوری طرح چور ہو جائے اور مکمل طور پر لہولہان ہو جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں مشرقِ وسطیٰ کے گڈریے قسم کے لوگوں کے مابین سنگسار کرنا رائج رہا، جس کا اکثر و بیشتر تذکرہ مسیحیت میں موجود ہے۔" (ایضاً)

حقیقتِ حال مزید واضح ہو رہی ہے:

"موجودہ صدی تک ملاح اور فوجی جوان دونوں جسمانی اور موت کی سزا کا تختۂ مشق بنے رہے اور نوآبادیاتی نظام کے قیام کے دوران یودوں کے ذخائر کی منتقلی اور کشتیوں کے چپو چلانے کے لیے ان کی روانگی کو متبادل بڑی سزا کے طور پر استعمال میں لایا گیا تھا۔" (ایضاً)

بلاشبہ یہ سب سزائیں بڑی سنگین، خوفناک اور ڈراؤنی تھیں۔ جبکہ مجموعۂ اسلامی قوانین اس قسم کی وحشتوں اور ہیبت ناکیوں سے مبرا ہے۔ اسلامی قوانینِ تعزیرات، جو قرآن مجید اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مبنی ہیں۔ اس قسم کی ہیبت ناک اور بیدرد سزاؤں سے خالی ہیں اور یہ سزائیں کبھی بھی مشروع و معمول بہ نہیں رہی ہیں۔

یورپ میں علم الجرائم کا کلاسیکی اور ایجابی اسکول

یورپ میں سنگین سزاؤں نے سخت گیر ردِّ عمل کو وجود بخشا تھا۔ اس لیے جرم و سزا کی سائنسی تحقیق کے آغاز سے ، بہتیرے اصلاحی اور انسدادی نظریات پیش کیے گئے اور جرائم کے حیاتیاتی اور تکوینی عوامل کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس طرح جرائم کے مختلف نظریات منصۂ شہود پر آئے تھے۔ نیز جرائم کے نفسیاتی، تحلیلی نفسیات اور نفسیاتی اسبابِ مرض کا وسیع تناظر میں جائزہ لیا گیا اور تجزیہ کیا گیا کہ نفسیاتی جذباتیت اور مرضِ سرقہ دونوں اضطراری اعصابی دباؤ اور اجباری اضطراب کی علامتیں ہیں۔ بہ ایں ہمہ یہ تمام تحقیقات اور معلومات انسدادِ جرائم کے مسئلہ کو حل کرنے میں بُری طرح ناکام ہو گئیں تھیں۔ اس حقیقت کو انسائیکلو پیڈیا نے بار بار تسلیم کیا ہے اور جس کا تذکرہ پہلے بھی کیا جا چکا ہے

سترویں صدی کے لگ بھگ ، جب علم الجرائم بحیثیت مستقل سائنسی مضمون کے روشناس ہونا شروع ہوا، تو یورپ میں ظالمانہ قوانین کے خلاف ہمدردی اور خدا ترسی کے احساسات کے نتیجہ میں کئی تحریکیں شروع ہوئیں۔ جناب قیصر بیکاریا۔ ایک اطالوی مصنف۔ نے جرم و سزا کے عنوان پہ ایک کتاب تحریر کی، جو نظریۂ علم الجرائم کے کلاسیکی مکتبِ فکر کی اساس قرار پائی۔ چنانچہ اس کلاسیکی مکتبِ فکر نے مجرموں کو سخت سزا دینے کے خلاف شدید احتجاج کیا تھا اور اس نے یہ دلیل دی تھی کہ سزا کا واحد مقصد مستقبل میں جرم کے ارتکاب کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ فی زمانہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ، کینیڈا اور دیگر کئی ممالک میں، کلاسیکی مکتبِ فکر کا مستقبل والا اصول ہی علم الجرائم کی اساس مانا جاتا ہے۔

اٹھارویں صدی کے اواخر میں، ایک دوسرا مکتبِ فکر ظہور پذیر ہوا، یہ علم الجرائم کا ایجابی (اطالوی) مکتبِ فکر کہلایا اور ایک اطالوی طبیب قیصر لامبراس، اس مکتبِ فکر کا اہم راہنما بن کر منظرِ عام پہ آیا تھا۔ جرم کے بارے میں اس کے سائنسی طرزِ فکر نے جدید علم الجرائم کی بنیاد ڈالی اور انیسویں صدی کے دوران، اس نظریہ نے جرم کی بابت متعدد و متنوع نظریات کو وسعت بخشی، جیسے:

"اس مکتبِ فکر نے نفسِ جرائم کی بابت رطب اللسان ہونے کے بجائے مجرمین اور ان کی حرکات و سکنات کے امکانی اسباب کے بارے میں مطالعہ و تحقیق پہ تمام تر

مجبوری کی بنا پر وجود میں آنے والی مجرمانہ عادتِ ثانیہ کو قابو میں لانا ماوراء ہے بہ نسبت مجرموں کے انضباط کے۔

واضح رہے کہ ان مکاتبِ فکر کے قیاسات و آراء ناکام ہوگئے۔ تاہم ایک انگریز فیلسوف اور قانونی مصلح، مسٹر جرمی بینتھم کی تصانیف نے بیکاریا مکتبِ فکر کے نظریات کو آگے بڑھایا اور اس نے اپنی تصنیف بعنوان "قانون اور اخلاقیات کی مبادیات کا تعارف" (۱۷۸۹ء) میں اپنے اہم نظریات سے بحث کی۔ بینتھم منفعتی افادیت پسند (Utilitarian) مکتبِ فکر سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے اس نظریہ کی حمایت میں دلیل یہ دی کہ ہر انسان خوشی کا متمنی اور پریشانی پر گریزاں ہے۔ لہٰذا ایک ایسی سوسائٹی قائم کی جانی چاہیے، جس میں بہتیرے لوگوں کو بہت زیادہ خوشحالی نصیب ہو۔ اس نے یہ بھی بحث کی کہ جرم کے اختتام تک سزا دینا کافی ہے لیکن اس سے زیادہ نہیں اور بیکاریا کی طرح سزا کے مہمل پن اور ماضی (اٹھارویں صدی) کے وحشیانہ قوانینِ تعزیرات کی ناکارہ پن اور بے تاثیری کو ثابت کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سارا یورپ انتہائی بے رحم تھا۔

بیسویں صدی میں ایک آسٹروی ماہرِ نفسیات جناب سگمند فروڈ (Sigmund Freud۔ سنِ وفات ۱۹۳۹ء) کی تصانیف نے سزا کے کردار پر بڑا گہرا اثر چھوڑا۔ اس نے ثابت کیا کہ حرام کاری، شہوانی محرکات، تلذذ کے طریقے، اعصابی اختلال (دباؤ) اور دماغی امراض وغیرہ اخلاقی خطاؤں کو ظہور میں لانے کی ذمہ دار ہیں۔ مختصراً فردونی نفسیات نے مجرم کو جنسی الجھاؤ و پیچیدگی میں مبتلا شخص کی مانند و مثل قرار دیا؛ جبکہ یہ جنسی الجھاؤ رسومات، اخلاقیات، مذہب اور معاشرہ کی ودیعت کردہ جنسی تحریکوں کے دباؤ کا نتیجہ ہے۔ اس طرح نفسیاتی تحریک نے یہ استدلال کرتے ہوئے کہ چونکہ انسان آزادانہ اپنے ارادہ و فعل کا مالک نہیں اس لیے وہ اپنی خطا کا بھی ذمہ دار نہیں۔ ایک نئے مکتبِ فکر کی بنیاد رکھی۔ پس یورپ میں جدید علم الجرائم نے ان نظریات سے بڑا گہرا اثر قبول کیا اور ساتھ ساتھ قانون ساز بھی ان نظریات سے بڑے متاثر ہوئے تھے۔ چنانچہ اس نظریہ کی رو سے یہ طے پایا کہ جرم ایک سوچا سمجھا فعل نہیں، بلکہ مجرم کے دفاعی مرض کا نتیجہ ہے، جو اس کے کنٹرول سے باہر ہے۔ وہ سزا کے بجائے ہمدردی کا مستحق ہے۔ باوجودیکہ یورپ میں جرائم کی بابت بالخصوص نرم رویّہ ہی بڑھتے ہوئے جرائم کا ذمہ دار ہے۔ اس طرح ان فلسفیوں نے فردونی نظریات کو مسترد کر دیا، جن کا خیال تھا کہ جنسی تحریک زندگی کا مرکز و محور نہیں ہے۔ کیونکہ مجرمین نہ تو کاہل و سست انسان ہوتے ہیں اور نہ ہی وہ حالات و زمانہ کے

نہیں ہے، تو مریضوں کی تعداد بڑھنی چاہیے تھی"!

فی الاصل مجرموں کی جانب نرم رویہ نہ صرف مسیحی و یہودی روایات کا مقرر کردہ قانونِ الٰہی قرار پایا۔ جس کو منسوخ کر دیا گیا اور ظالمانہ سزا تصور کیا گیا۔ (اگرچہ چرچ نے آج تک قہر خداوندی کے نظریے کی ہی تبلیغ کی ہے) ۔ بلکہ دنیاوی و لادینی عدالتیں اور قانون ساز ادارے (مقننہ) بھی اس سے متأثر ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے متبادل سزائیں منتخب کر لیں۔ تو اس طرح آج کے دور میں شاید ہی حد (سزا) پر عمل ہوتا ہو۔ اس کے باوجود فی زمانہ چند جرائم کی سزا موت ہے۔ جسمانی سزا اور حد کا تصوّر تقریباً مفقود ہو چکا ہے۔ سکنڈے نیوین (Scandinavian) ممالک (سویڈن، ناروے، ڈنمارک اور آئسلینڈ)، مغربی جرمنی، ہالینڈ، آسٹریا، اٹلی، پرتگال اور سوئٹزرلینڈ سے موت کی سزا ختم ہو چکی ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، محوّلہ بالا، صفحہ ۸۶۳، کالم نمبر ۲) ۔

تقابلی قانون کا ایک طالب علم معاشرتی علوم کے تجزیاتی طریقہ ہائے کار کے نتائج کو جاننا پسند کرے گا۔ جن کو علم الجرائم پر منطبق کیا گیا تھا۔ اس کی جانب سے تحقیق طلب سوال یہ ہیں۔ آیا علم الجرائم، علم معاشرت اور علمِ نفسیات کے مابین تعلق اور قانونی تحقیقات پر ان کے اطلاق نے قابلِ محسوس نتائج برآمد کئے تھے؟ آیا ان علوم نے مجرمین کو سزا دینے کے بارے میں عدالتی طرزِ فکر کو یا قانون نافذ کرنے والے اداروں کی منصوبہ بندی کے طریقوں کو سدھارا اور بہتر بنایا؟ آیا جرائم کی تجربہ گاہوں، جن کو جرائم کی تشخیص اور ان جرائم کے اظہر من الشمس ثبوت (جیسے کاغذات نشہ اور دوائیں، منشیات، انگلیوں کے نشانات کی چھان بین یا علوم عدلیہ) فراہم کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے نے جرم کے انسداد کے ضمن میں واقف کار محققین کی مدد کی؟ ان سب سوالات کے جوابات نفی میں ہیں۔ شاید انہوں نے صرف اور صرف جرائم کی سراغ رسانی کے سلسلہ میں ماہرین محققین کی مدد کی ہے، نہ کہ جرائم کے انسداد اور ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے۔ حالانکہ قوانینِ موضوعہ کے کنٹرول کے ساتھ ساتھ اور سزا تجویز کرنے والوں کی جانب سے جرم کے ضمن میں اضافی انسدادی نظریات کے پیش کئے جانے کے باوجود جرائم لگاتار بڑھ رہے ہیں۔

امریکی علم الجرائم کے ماہرین نے جداگانہ صحبت کے نظریہ یعنی مجرموں کی صحبت سے مجرمانہ سلوک کو جاننا، کو ترقی دی۔ ایک دوسرے مکتبِ فکر نے یہ رائے پیش کی کہ معاشرہ کا منہاج ہی بعض افراد کو مسلّم معاشرتی اہداف جیسے دولت اور مقام کے حصول کے لیے مجرمانہ عادات و اطوار کو اپنانے پر

فی الحقیقت مغرب میں طرزِ معاشرت اور فنونِ ثقافت اپنے عروج کو پہنچ چکے ہیں ۔ لیکن شماریاتی جائزے اِس حقیقتِ حال کو واضح کریں گے کہ اُن معاشروں کی تقاویر پر جرائم کتنے مسلّط ہو چکے ہیں ۔

ورلڈبک انسائیکلوپیڈیا، جلد نمبر ۴، ۱۹۸۳ء (ریاست ہائے متحدہ امریکہ)۔ (صفحات ۹۰۸ جی ۔ ایچ ۔ آئی) بھی یورپ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں جرائم کے اضافے کے بارے میں حیرت انگیز معلومات فراہم کرتا ہے ۔ اس کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق، ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سب سے بڑی پیشہ ورانہ تنظیم، امریکی سوسائٹی آف علم الجرائم، سنِ تاسیس ۱۹۳۹م، جرائم کے انسداد میں بُری طرح ناکام ہو چکی ہے ۔

اسلامی تعزیری فلسفہ

اسلام میں انصاف کو ساقط کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے، خواہ یہ اسقاط ہمدردی، رحمدلی اور معافی کے نام سے ہو یا انسانی خطاؤں اور جنسی کمزوریوں کے نقطۂ نظر سے ۔ حدود اللہ اور اسلامی تعزیرات کے نفاذ کے سلسلے میں قرآنِ مجید نے نظریۂ ترس کی بڑی سختی سے تردید کی ہے اور ایمان والوں پر لازم ٹھہرایا ہے کہ :

"اگر تم خدا اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو خدا کے حکم (سو دُرّے مارنا) کے نفاذ میں تمہیں ان پر ہرگز ترس نہ آئے ۔" (سورۂ نور ۔ ۲)

اسلامی قوانین تعزیرات کا فلسفہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ جو نبی نوعِ انسان کا حقیقی مالک و خالق ہے ۔ وہ علم الجرائم، نفسیات اور عمرانیات کے ماہرین کی بہ نسبت انسان کی فطری ترکیب کی اصلاح کے ضمن میں اعلیٰ اور افضل علم رکھتا ہے ۔ انسان باوجود اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کے بالآخر اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے ۔ کیونکہ انسان نے ہی بُرائی اور بدی کو خشکی اور تری دونوں میں پھیلایا ہے ۔ قرآنِ مجید انسان کو اس کے کیے کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے :

"خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا ہے ۔ تاکہ خدا اُن کو اُن کے بعض اعمال کا مزا چکھائے ۔ (سورۂ روم ۔ ۴۱)

مذکورہ بالا آیات قرآن پر مبنی اسلامی فلسفۂ تعزیر کسی حالت میں بھی اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود میں کمی بیشی کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا ۔ اگر ایک دفعہ جرم سرزد ہو گیا اور اس کے شواہد

پختہ ہو گئے، تو مجرم کو اس کے جرم کی نوعیت کے مطابق سزا ضرور دی جائے گی۔ اسلام کی نظر میں ہر جرم گناہ ہے اور ان دونوں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی ہوتی ہے۔ چونکہ اسلامی تعزیری قوانین کا مقصد معاشرہ سے جرائم کا خاتمہ اور اُن کا مکمل سدِباب ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلام انصاف کے تقاضوں کی تکمیل میں دخل اندازی بصورتِ رحم و ہمدردی کی اجازت نہیں دیتا، جبکہ یورپ میں رحم کی تحریکوں کے نتائج کو پہلے سے جانچا اور پرکھا جا چکا ہے۔ اسلامی تعزیری قوانین نے مشاہداتی مثبت جھلک اور سائنسی ذرائع کے استعمال کے بغیر ہی معاشرتی برائیوں اور بدکاریوں کے خاتمہ کا اپنا ہدف پورا کر لیا ہے۔ سزا کے فلسفہ کا سب سے اوّلین اصول اللہ تعالیٰ پر ایمان اور قیامت کے روز اس کے ہاں جواب دہی کا احساس ہے۔ ہر مومن رات کے سخت اندھیرے میں بھی ہر قسم کے گناہ کے ارتکاب سے باز رہتا ہے، کیونکہ اس کا راسخ عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے۔ علاوہ ازیں دو فرشتے بھی، جو تمام انسانوں کے افعال و اعمال کا تحریری ریکارڈ رکھتے ہیں۔ (سورۃ زخرف - ۸۰) اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بندے کے اعمال کے مطابق سزا دے گا یا جزا دے گا۔ (سورۃ اسرار - ۱۳ اور ۱۴ اور سورۃ جاثیہ - ۲۸ اور ۲۹) - ایک شخص جو اس قسم کے عقائد کا معتقد نہیں ہے، لازم ہے کہ اس سے کسی بھی مقتدرہ اور مجاز و مختار ہستی کے خلاف کوئی بھی خطا و غلطی سرزد ہو اور عین ممکن ہے کہ وہ اخلاقیات اور قانون کی حدود و قیود کو پھاند ڈالے، جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔ وہ کسی صورت میں بھی نہ تو حرص و آز برائے مادی وسائل اور طلبِ جاہ کو چھوڑ سکتا ہے۔ نہ ہی حریصانہ ترغیبات اور نفسانی خواہشات کو دبا سکتا ہے اور نہ ہی احساسات وجذبات پر قابو پا سکتا ہے، خواہ دن کی روشنی ہی کیوں نہ ہو۔ اس قسم کے اصحاب کردار کو قرآن مجید نے چار پایوں جیسا بیان کیا ہے۔ (سورۃ اعراف - ۱۷۹) - ایسے مجرم مال و دولت اور اقتدار کے ذریعے وکلاء اور ججوں کا استیصال کر کے، اور سفارش کا بندوبست کر کے اپنے آپ کو بری کروا سکتے ہیں اور قانون کی گرفت سے لازماً بچ سکتے ہیں۔

اسلام سائنسی تحقیقات سے استفادے کی حتمی طور پر اجازت دیتا ہے اور اس قسم کی تمام تحقیقات سر آنکھوں پر۔ لیکن اگر یہ تحقیقات خدا تعالیٰ کے وجود کی نفی کریں اور ان کی بدولت انسان قیامت

کے روز اور اس دن کی سزا و جزا وغیرہ پر ایمان نہ رکھے۔ تو وہ یقیناً فضول اور مہمل ہیں۔ علم الجرائم کے سلسلہ میں استعمال شدہ کوئی بھی سائنسی تحقیق عملاً کامیاب نہیں ہو سکتی، اگر یہ وجدانی شعور اور آگہی سے علیحدہ اور دور رہے۔

واقعاتی شہادتیں

اسلامی فلسفۂ تعزیر کسی معاملہ میں بھی واقعاتی شہادتوں کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اس سے پہلے بھی یہ بحث ہو چکی ہے کہ ایک اسلامی ریاست بحیثیت تمام شہریوں کی سرپرست ہونے کے، ہر شہری کو اس کی بنیادی ضروریات مہیا کرنے کی پابند ہے اور ہر شہری کے لیے مساوی مواقع اور برابر سہولتیں مہیا کرنا بھی شامل ہے۔ یہ مساویانہ برتاؤ ہر شہری کو موقع و محل مہیا کرتا ہے کہ وہ بغیر کسی دشواری کے اپنی تقدیر آزمائے۔ حکومت کے خزانہ (بیت المال) پر بھی لازم ہے کہ وہ محتاجوں اور اپاہجوں کی نگہبانی کرے۔ اس قدر آزادی اور سہولتیں فراہم کرنے کے باوجود، اگر ایک شخص کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے، تو وہ کسی قسم کی ہمدردی کا مستحق نہیں ہے اور وہ سزا کا سزاوار ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ مساوی طرزِ معاشرت میں کسی قسم کی خرابی واقع نہ ہو اور معاشرہ پاک و صاف رہے۔ جب ایسے ملزموں کو سزا دی جاتی ہے اور انصاف قائم کیا جاتا ہے۔ تو اس طرح لامحالہ عوام الناس کو سبق حاصل ہوتا ہے۔

خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے واقعاتی شہادتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، چوری کی سزا کو قحط اور خشک سالی کے زمانے میں گھٹا دیا تھا اور ایک چوری کرنے والے بھوکے شخص کی سزا گھٹا کر صرف جرمانے تک محدود کر دی تھی۔ مثلاً اونٹوں کے چوروں کو خلیفۂ ثانی کی جانب سے جرمانہ ادا کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور وہ جرمانہ اونٹ کی قیمت سے دوگنا ہوتا تھا۔ نیز ہر بھوکے آدمی کو باور کرایا گیا تھا کہ وہ مالی اعانت کے لیے حکومت سے رجوع کرے اور چوری سے باز رہے اس طرح ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ شرعی قوانین کو صرف ایک اسلامی ریاست میں ہی نافذ کیا جا سکتا ہے، نہ کہ جدید لادینی ریاستوں میں، جہاں کا ہر تیسرا اور چوتھا فرد کسی نہ کسی ذاتی جرم کی پاداش میں سخت سزا کی تکلیف اٹھاتا ہے۔ چونکہ اسلام ایسے حالات اور

داعیات کی بیخ کنی کرتا ہے، جو جرم کرنے پر اکسانے کا باعث بن سکتے ہیں یا جرم کے ارتکاب کے لیے فطری جذبات کو ابھار سکتے ہیں۔ چنانچہ اسلام نے سماجی پابندیوں کو عائد کر دیا ہے اور اخلاقی معیار مقرر کر دیے ہیں۔

جدید معاشرہ میں اخلاقی ابتری اور اسلامی جانچ پڑتال

چونکہ انسان موجودہ مادہ پرستانہ معاشرہ میں جنسی بے اعتدالیوں اور اخلاقی انحطاط کا شکار ہو چکا ہے، چنانچہ انسان کے اخلاقی مطمحِ نظر میں بنیادی تبدیلی کے بغیر ان شکنجوں سے نجات پانا ممکن نہیں ہے۔ جبکہ یہ تمام شکنجے تہذیب کی اقدار بن چکے ہیں۔ آزادانہ اور رضاکارانہ جنسی تعلقات، زناکاری، کسینو، نائٹ کلب، وڈیو ٹیلی ویژن، ڈسکو، نشہ آور ادویات، مسلسل اور وحشت نشا رقص و سرود، ساحلی خودسری اور شہوانی جنون، آفتابی غسل گاہیں، مخلوط تقریبات تبادلۂ ازواج، امرد پرستی اور ہم جنس پرستی وغیرہ وغیرہ نے ایک طرف تو آداب و اخلاقیات کی چولیں ہلاک کر رکھ دی ہیں اور دوسری طرف یہ سب جنسی زراجیت، طوفانِ بدتمیزی اور جرائم کو بڑھا رہے ہیں۔

ٹیلی ویژن اور وڈیو نے برہنگی کو بے حد پھیلایا ہے اور جن افراد کے گھروں میں یہ دونوں موجود ہیں۔ گویا ان کے گھروں میں مکمل طور پر نائٹ کلبوں کے مناظر موجود ہیں۔ غازہ کے استعمال سے اور بناؤ سنگھار کے ذریعے سے دوسرا روپ دھار لینے اور چہرے کی جھریوں کو اوپر کی طرف کھنچوانے نے اعلیٰ اقدار کا ستیاناس کر دیا ہے۔ نیز بین الاقوامی برہنگی کی تحریک نے مغرب میں برہنہ و عریاں کلبوں کو وجود بخشا ہے اور اس تحریک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پانچ کروڑ افراد نے بڑی سرگرمی سے اس تحریک میں شرکت کی ہے۔ لہٰذا عریانی ایک عام عادت اور مقبول معیار بن چکی ہے اور یہ کسی اعتبار سے بھی معقولیت و شائستگی کو ٹھیس نہیں پہنچاتی۔

اس قسم کی مکدّر فضا میں کوئی شخص اسلامی قانون کی بابت سوچ بھی نہیں سکتا، جبکہ غیر مسلم اور ترقی پسند مسلمانوں کے ذہن مذہبی سماجی حد بندیوں اور اسلامی اخلاقی پابندیوں کو تسلیم کرنے سے ہی خوف زدہ ہیں۔ حالانکہ یہ پابندیاں بگڑے ہوئے اور تباہ حال معاشرہ، جس معاشرہ کو قرآن مجید نے جاہل معاشرہ قرار دیا، (۳۳ ۔ ۳۳)، سے ان برائیوں کو جڑ سے اکھیڑ دیتی اور

ختم کر دیتی ہیں۔

اسلام نے بعض حدود و قیود عائد کر رکھی ہیں، جو بگڑتی ہوئی صورتِ حال کو درست کرتی ہیں جنسی بے اعتدالیوں کو ختم کرنے کے لیے، اسلام نے تجرّد کی زندگی کی مذمت کی ہے اور شادی کو لازمی قرار دیا ہے۔ (سورۂ نور۔ ۳۲ اور ۳۳)

علاوہ ازیں ازدواج کو انسان کے آدھے دینِ اسلام کی تکمیل شمار کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بندۂ خدا اپنی شادی کے ساتھ ہی اپنے آدھے دین کو مکمل کر لیتا ہے اور اس کو بقیہ نصف دین کے بارے میں فکر کرنی چاہیے۔"

فی زمانہ جنسی آزادی کی تحریک کی جانب سے ازدواجی زندگی کو چیلنج کیا گیا ہے۔ اس طرح عورت اور مرد ازدواجی ذمہ داریوں سے خلاصی پاتے ہوئے، مجرّد رہنے اور جنسی آزادی کے مزے لوٹنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس طرح جرم کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا ہے۔ لہٰذا اسلام نے ایک ضرورت مند شخص کو چار شادیوں کی اجازت دے کر مزید جرائم کے اسباب کی بیخ کنی کی ہے، یہ اجازت صرف اس صورت میں ہے جبکہ وہ شخص شرعی جواز کے تحت اپنی پہلی بیوی سے بے چین و غیر مطمئن ہو یا طبی وجوہات کی بنا پر دوسری شادی کا محتاج ہو مثلاً بشری قوت اس کی متقاضی ہو۔ تاہم کسی حالت میں بھی اس کو یہ اجازت نہیں دی گئی ہے کہ وہ قسما قسم کی رنڈیوں کو کرائے پر حاصل کر لے یا اپنی داشتاؤں سے مزے لوٹے اور وہ اس طرح غیر شادی شدہ والدین کی حیثیت اپنا کر اس قسم کے والدین کی تعداد میں اضافہ کرے اور حرامی بچوں کے وجود سے سارے معاشرہ کو ناپاک کر دے۔ جبکہ اسلام نے ایک بیوہ اور رنڈوے کو بجائے غیر محرم ساتھی یا خلافِ شرع نام نہاد جوڑا بن کر گپ شپ لگاتے یا محض وقت گذاری کے لیے مزے لوٹنے کے، دوبارہ شادی کرنے کی اجازت ہی نہیں، بلکہ عقدِ ثانی کی ہدایت بھی دی ہے مزید برآں جنسی بے اعتدالیوں کے تدارک کے لیے اسلام کی جانب سے نوعمری کی شادیوں کی ترغیب دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان والدین کے لیے جزا اور انعام مقرر کر رکھا ہے جو اپنے نوخیز اور نوجوان بچوں کا خیال رکھتے ہیں اور بالخصوص اپنی بیٹیوں کو بیاہ دیتے ہیں جیسے ہی وہ سنِ بلوغ کو پہنچتی ہیں۔ اس طرح جرائم پر آمادہ کرنے والے حالات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔

روزمرّہ کی زندگی میں دیگر سماجی رجحانات کے بارے میں بھی جانچ پڑتال (اسلام دوستی) ضروری ہے۔ کیونکہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن اور صحابہ کرام کی بیویوں رضی اللہ عنہن کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ اپنی اوڑھنیوں سے اپنے سارے بدن کو ڈھانپ رکھا کریں (سورۂ احزاب: ۵۹) تاکہ کسی قسم کی برہنگی نہ ہو اور اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں۔ (سورۂ نور۔ ۳۰ اور ۳۱)۔ علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق، بے شرمی وبے حیائی سے نظریں گاڑنا (ٹکٹکی نگاہیں[لہ]) زنا کے ارتکاب تک لے جاتی ہیں۔ قرآن مجید ایمان والوں کو ہدایت کرتا ہے کہ گھروں میں پچھواڑے کے بجائے سامنے دروازے سے داخل ہوا کرو۔ (سورۂ بقرہ: ۱۸۹)۔ اسی لیے معاشرہ کو پاک وصاف رکھنے کے لیے جھوٹی افواہوں اور تہمتوں وغیرہ کی ممانعت کی گئی ہے (سورۂ نور: ۴ اور ۵)۔ دیگر اکثر وبیشتر ممانعت کے اقدامات میں سے یہ صرف چند اقدامات ہی تھے جنہوں نے معاشرہ سے جرائم کا سدِباب کر دیا تھا۔ جبکہ سزا تو صرف آخری حربہ ہے۔ قرآنِ مجید نے گناہ گاروں کو بارہا یاد دلایا ہے کہ قیامت کے روز ان کو (اپنے گناہوں کی پاداش میں) تلچھٹِ جہنم کا عذاب بھگتنا ہوگا (سورۂ فرقان: ۶۸ اور ۶۹)۔ چنانچہ قرآنی تنبیہات جرائم کے تدارک کے لیے بڑی کارگر ثابت ہوئی ہیں۔ لہٰذا کوئی بھی حقیقی مومن قیامت کے روز تلچھٹِ جہنم میں خدا کی جانب سے دوہری سزا بھگتنے کے لیے تیار نہیں ہے اور سزا کا یہ ڈر جرائم کے ارتکاب کے سلسلہ میں ہلکے سے خیال کو بھی رفع کر دیتا ہے۔

تقابلی قانون کا ایک طالب علم یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ مغربی قانون دان جدید علم الجرائم کی بیکاری وبے اثری سے کس قدر نالاں ہیں۔ وہ جدید علم الجرائم سے بیزار ہوکر، دوبارہ ان مجرموں کے لیے سخت اور شدید سزاؤں کے نفاذ کی سفارش کر رہے ہیں۔ جو تجربہ کار حقیقت پسندوں کے نظریۂ شفقت وترس سے شہ پاکر دیدہ دلیر مجرم بن چکے ہیں۔ جناب۔ جے۔ ڈبلیو۔ سالمند

لہ فی زمانہ اس قسم کی نگاہ غیر محرم اور نازک اندام عورت پر میٹھی نظر ڈالنا کہلاتی ہے اور یہ میٹھی نظر بڑے اور اہم مسائل کے حل کے لیے بھی بڑی کارآمد اور مفید سمجھی جاتی ہے۔ الامان والحفیظ۔ مترجم

نے ایک مشہور و معروف کتاب "علمِ قانون - Jurisprudence" (دسواں ایڈیشن، اصلاح شدہ از جی ۔ کے ۔ ولیم) تحریر کی ہے ۔ یہ کتاب قانونِ تعبیر کے موضوع پر سب سے بڑھ کر معیاری اور معتبر کتاب قرار دی جاتی ہے ۔ اس کتاب کا مصنّف بذاتہ سفارش کرتا ہے کہ اگر زندہ جلا دینے کی سزا مجرموں کو فی الاصل جرائم کے ارتکاب سے باز رکھتی ہے، تو تمام قسم کے خواہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ ہوں، کی پاداش میں ان مجرموں کو زندہ جلا دینا چاہیے ۔ جناب محمد اقبال صدیقی صاحب، اپنی کتاب "اسلام کا قانونِ عقوبات" (ناشر قاضی پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۹ء، صفحات ۳۰ اور ۳۱) میں فرماتے ہیں، ان کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے :

"بالفاظِ دیگر، اگر سزا کی شدت کا امتناعی و مزاحمتی اثر اتنا مستقل اور مکمل تھا، تو بہترین قانون وہی سمجھا گیا ہوگا، جس نے بے حد سختی اور بلا امتیاز شدت کی بنا پر مؤثر انداز سے جرم کو مٹا دیا تھا ۔ آیا سب انسانوں کی فطرت اس قسم کی ہے کہ مجرموں کو زندہ جلا دینے کی صرف ایک دھمکی ہی یقینی طور پر قانون کے رخنوں کو بند کر دیتی ہے ۔ تو پھر یہ سزا تمام جرائم ۔ اونچی غداری سے لے کر معمولی سی چوری تک ۔ کے لیے بالکل درست اور خاصی کارگر سزا ہوگی ۔"

بلاشبہ یہ سرگزشت انسانی قانون کی بے بسی و بے چارگی کے ضمن میں، قوانین موضوعہ اور ان سے بڑھ کر اصلاح پسندوں کے نظریۂ رحمدلی کے بارے میں ایک بے حد ناقابلِ اصلاح لعن طعن ہے، جنہوں نے بائبل مقدس کے قوانین کو ظالمانہ قرار دے کر ٹھکرا دیا تھا ۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ قانونی مصلحین حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی تعلیمات سے استفادہ کرنے میں ناکام رہے حضرت عیسٰی علیہ السّلام کا فرمان یہ تھا کہ:

"پس اگر تیری دہنی آنکھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اسے نکال کر اپنے پاس سے پھینک دے کیونکہ تیرے لیے یہی بہتر ہے کہ تیرے اعضاء میں سے ایک جاتا رہے اور تیرا سارا بدن جہنم میں نہ ڈالا جائے اور اگر تیرا دہنا ہاتھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اس کو کاٹ کر اپنے پاس سے پھینک دے کیونکہ تیرے لیے یہی بہتر ہے کہ تیرے اعضاء میں سے ایک جاتا رہے اور تیرا سارا بدن جہنم میں نہ جائے ۔" (متّی کی انجیل، باب ۔ ۵، آیات ۔ ۲۹ اور ۳۰) ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جرم کرنے والی آنکھ یا ہاتھ کو کاٹا گیا تھا اور اسی طرح جرم کرنے والے معاشرہ کے ممبر کو ختم کرنا ہوگا۔ لہذا جرم کے دوبارہ ارتکاب کو روکنے کے لیے سخت سزا تجویز کی گئی ہے۔ لواطت اور زنا۔ جو تفریح طبع کا سامان اور وقت گذاری کے مسرت بھرے مرحلے بن چکے ہیں ۔ ان جدید ماہرین علم الجرائم یا مصلحین کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے، جو انجیل مقدس کی واضح اور مبرھن ہدایات کی طرف اپنی توجہ مبذول نہیں کرتے۔ خبردار قدیم عہد نامہ بھی اتنا ہی واضح ہے جتنا کہ جدید عہد نامہ :

"اور جو شخص دوسرے کی بیوی سے یعنی ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرے وہ زانی اور زانیہ دونوں ضرور جان سے مار دیے جائیں ۔"

"اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے منسوب ہوگئی ہو اور کوئی دوسرا آدمی اسے شہر میں پاکر اس سے صحبت کرے، تو تم ان دونوں کو اس شہر کے پھاٹک پر نکال لانا اور ان کو تم سنگسار کر دینا کہ وہ مر جائیں ۔" (استثنار ۲۲ : ۳۲)۔

مفرواتِ بائبل مقدس از ہاسٹنگ (جلد نمبر-۳، صفحہ نمبر ۲۷۳)، سزا کے طریقہ کی حسبِ ذیل انداز سے وضاحت کرتی ہے :

"قانون میں واحد تسلیم شدہ حد کی شکل سنگسار کرنا ہے .... ۔ ......
گواہوں پر لازم ہے کہ پہلا پتھر وہ خود ماریں ۔"

عقل بمقابلہ وحی

یہ امر واقعہ ہے کہ جدید معاشرہ منشیات کی بھینٹ چڑھ چکا ہے۔ اس پھیلی ہوئی بیماری بوسیلۂ الکحل اور نشہ آور ادویات، جو جرائم کی مائیں کہلاتی ہیں، نے تمام معاشرہ کو اچھوت زدہ بنا دیا ہے اور اب تک نہ ہی کسی قسم کی قانون سازی بھی اس کو ختم کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جو جدید تہذیب کا مرکز و محور ہے، نے شراب اور الکحل کی مذمت میں اپنی ساری عقل و دانش استعمال کر لی تھی اور اس نے الکحل کے شدید خطرات سے نجات پانے کے لیے اور معاشرہ کو اخلاقی انحطاط سے بچانے کے لئے اپنی تمام تر مخلصانہ مساعی صرف کر دیں تھیں۔

نیز الکحل کے مالی نقصانات اور جسمانی جوکھوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لیے کروڑوں امریکی ڈالروں کی تخصیص سے ایک وسیع پیمانے پر مہم شروع کی گئی تھی۔ بالآخر امریکی دستور میں اٹھارویں ترمیم کے ذریعے اس پر قانونی پابندی لگا دی گئی تھی۔ بعدازاں دونوں ایوانِ نمائندگان۔ کانگرس اور سینٹ نے اس قانون کی منظوری بھی دے دی تھی اور چھیالیس ریاستوں نے بھی اس کی توثیق کر دی تھی۔ جبکہ امریکی عوام نے اس ترمیم کے حق میں ووٹ دیے تھے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد اس نافذ العمل قانون کے تنفیذ کے بجائے سارے ملک میں خفیہ زیر زمین اور غیر قانونی شراب کی دوکانیں کھولی گئیں اور شراب کی بھٹیاں لگائی گئیں۔ الکحل کا ناجائز استعمال اور اس کی قیمت دونوں بڑھ کر دس گنا ہو گئے اور شراب کی گشتی دوکانیں گھر گھر جا کر شراب پہنچانے کے لیے سرگرمِ عمل ہو گئی تھیں۔ نیز شراب کے حصول کے لیے خفیہ الفاظ اصطلاحوں (SECRET PASS-WORDS) کا استعمال عام ہو گیا تھا۔ دور دراز کے قصبوں اور دیہاتوں نے بھی، جہاں اس سے پیشتر اس قسم کی شراب کی بھٹیاں کبھی قائم نہ ہوئی تھیں، شراب کشید کرنی شروع کر دی تھی۔ اس طرح یہ قانون بُری طرح ناکام ہو گیا تھا اور چودہ یا پندرہ سال بعد یہ شراب کا قانونِ حرمت منسوخ ہو گیا تھا اور عمل پذیر نہ ہو پایا۔ یوں ساری امریکی عوام، جس نے شراب کے قانونِ حرمت کے نفاذ کی حمایت میں ووٹ دیے تھے، نے اسی قانون کی تنسیخ کی غرض سے اپنا ووٹ استعمال کیا۔ پس ثابت ہوا کہ قوانینِ موضوعہ تمام انسانوں کی نفسیات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ حالانکہ ان دونوں کے حق میں بشری استدلال اور عقلی تعلیل بڑے مضبوط مہرے ہیں۔

متذکرہ بالا صورتِ حال کا موازنہ کرنے سے، ہر شخص وحی کی قدرت کو دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے، جو ایمان والوں کی نفسیات کے لیے مشعل اور رہنمائی ہے۔ چنانچہ اسلام کے حق میں بھی یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ تقابلی قانون کا ہر ایک طالب علم تمام تر اور بالکلیہ طور پر اس چیز کا قائل ہے کہ کوئی بھی قانون دینی و مذہبی اساس کے بغیر جرائم کی بیخ کنی کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ عربی شاعری میں یہ ثبوت ملتا ہے کہ دورِ جاہلیت کے عرب شراب کے بڑے رسیا اور عاشق تھے اور انہوں نے مختلف قسم کی شراب کے ڈھائی سو ۲۵۰ نام وضع کیے تھے۔ ہم بجا طور پر یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ اس قسم کی مثال کسی زبان و ادب کی تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ اس صورتِ حال

ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب کے بارے میں شریعت کا حکم دریافت کیا گیا، تو آپؐ نے فرمایا کہ خدا کا ارشاد یہ ہے کہ "یہ فوائد اور نقصانات دونوں کی حامل ہے" (سورۂ بقرہ۔ ۲۱۹)۔ یہ کوئی حکم نہ تھا بلکہ یہ صرف شراب کی حقیقت کی لفظی وضاحت تھی۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ ایک گروہ نے اسی وقت سے شراب نوشی ترک کر دی۔ اس کے بعد ایک اور آیت کریمہ نازل ہوئی۔ جس نے تمام مسلمانوں کو نشے کی حالت میں نمازیں پڑھنے سے روک دیا تھا۔ (سورۂ نساء۔ ۴۳) مسلمانوں نے اس کی بجا آوری کی اور نماز کے اوقات میں مے خواری سے بالکلیہ اجتناب کر لیا اور مے خواری کے لیے مخصوص اوقات مقرر کر لیے اور پھر تیسری آیت کریمہ نازل ہوئی، جس نے شراب نوشی پر مکمل طور پر پابندی عائد کر دی تھی۔ قرآن کریم (سورۂ مائدہ: ۹۰ اور ۹۱) کے الفاظ کے معانی حسب ذیل ہیں:

> "اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے (یہ سب) ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں۔ سو ان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش ڈلوا دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو تم کو (ان کاموں سے) باز رہنا چاہیے۔"

جونہی یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو مسلمانوں نے یکایک شراب کے کاسہ و جام اور مٹکے و مشکیزے اور شراب کی بھٹیاں ہمیشہ کے لیے بیکار و برباد کر دیں۔ شراب کے رسیا عربوں نے تحریم شراب کی منادی سنتے ہی شراب کے بھرے ہوئے جام روک لیے اور منہ سے لگے ہوئے پیالے فوراً لبوں سے الگ کر کے توڑ دیے۔ جبکہ مدینے کی گلیوں میں شراب کے نالے بہ گئے۔ اس طرح شراب کو بتدریج تین مرحلوں میں حرام کیا گیا تھا اور اسلامی معاشرہ سے شراب کی لعنت کو ختم کیا گیا تھا جو ام الخبائث ہے۔ گذشتہ چودہ صدیوں سے شراب کی حرمت کی افادیت قائم اور مسلّم ہے اور اسی طرح یہ روز قیامت تک قائم و دائم رہے گی۔ کوئی بھی ریاست ملک، اس کی پارلیمنٹ یا قانون ساز ادارے (مقننہ) قوانین خداوندی کو تبدیل نہیں کر سکتے، خواہ وہ سب سازش سے اس قبیح حرکت کے کر گذرنے پر متفق الرائے ہو جائیں۔ لہٰذا ہر کوئی بآسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ شراب کے خلاف نہ تو کوئی عظیم الشان مہم چلائی گئی اور نہ پروپیگنڈہ اور تشہیر کے لیے ایک پیسہ خرچ

کیا گیا۔ بلکہ صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ذوالجلال کی طرف سے مناہی آئی تھی۔ باوجودیکہ آج کے دور میں بھی بعض بے عمل مسلمان شراب پیتے ہیں، تو وہ بزعمِ خویش اپنے آپ کو ایک گناہ گار اور ایک بڑے گناہ کے ارتکاب کا مجرم جان کر دکھ اٹھاتے ہیں۔ اور بعد از گناہ وہ بے حد نادم اور بے انتہا پشیمان ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس موضوع کی بابت مزید تفصیلات کے لیے، تنقیحات از مولانا مودودی مرحوم و مغفور کی کتاب میں شامل شدہ متعلقہ مضمون کا مطالعہ بھی فرمالیں۔
(اسلامی پبلی کیشنز) لاہور۔ ۱۹۷۹ء، صفحات۔ ۴۶ تا ۶۰۔

اسلامی مجرموں کی قدر تطہیری

ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر جرم اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی ہوتے ہوئے ایک گناہ ہے اور ہر گناہ قیامت کے روز ایک قابلِ مواخذہ جرم ہے۔ پس اس دنیا میں اس کی سزا پالینا اور اپنے آپ کو پاک وصاف کر لینا ہی زیادہ بہتر اور افضل ہے۔ چنانچہ یہ طریقہ ایک قسم کا عملِ تطہیر ہے۔ جو اس دنیا میں ہی مجرم کو اس کی بداعمالیوں اور بدکاریوں سے پاک کر دیتا ہے۔ یہ اسلامی قانونِ تعزیر کا بنیادی فلسفہ و حکمت ہے۔ جس نے مجرموں کو سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ اقدس میں حاضری پر اور اپنے جرم و گناہ کے اقرار و اعتراف پر اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سزا کے نفاذ پر اکسایا تھا، تاکہ وہ یوم الحساب کو اپنے مالک و رب کے روبرو طاہر و پاک ہو کر حاضر ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ اس جہاں کی سزا آخرت کی جہنم کی آگ سے ہلکی اور آسان ہے اور مؤرخین بھی اس قسم کی مثالیں تاریخ میں قلم بند کر چکے ہیں۔ جن کا اس مقام پر دہرانا لاحاصل ہے۔

گذشتہ بحث سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اسلامی قانونِ تعزیر کو اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اس کے فلسفۂ اخلاق سے الگ اور علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ اسلامی قانونِ تعزیر کو صرف اور صرف اس اسلامی معاشرہ یا اسلامی سوسائٹی میں نافذ کیا جاسکتا ہے۔ جہاں کوئی بھی انسان حالات اور تقاضوں سے مجبور ہو کر جرم کا ارتکاب نہ کرے۔ کوتاہ عمل اور بے دین اسلامی ریاستیں، جہاں معاشرہ بذاتِ خود بدی کا پرستار بن چکا ہو تو شریعتِ الٰہی کے نفاذ کو ظلم و ستم اور جبر و استبداد سمجھیں گی، تو اسلامی قانونِ تعزیر ایسے معاشرے میں کیسے

نافذ ہو سکتا ہے ۔جہاں حکومت بذاتِ خود حرام کاری کے لیے اور شراب کی دوکانوں ، کسینو اور نائٹ کلب وغیرہ کے قیام کے لیے اجازت نامے جاری کرتی ہے ۔ لہٰذا اس قسم کی سوسائٹی میں ، جو انسان کو کھلے عام جرم کرنے کی دعوت دیتی ہے اور جرائم کی حمایت و افزائش کرتی ہے اور جہاں تین میں سے ایک فرد کو سنگسار کیا جائے اور تین میں سے دوسرے کا چوری کی سزا کے بطور ہاتھ کاٹا جائے ، یا وہ تیسرا شخص اپنے سے سرزد ہونے والے جرائم کی خاطر اسّی یا ایک صد کوڑے کھائے۔ اسی لیے بے دین ذھنیتوں والے مسلمان صرف اسلامی قانونِ تعزیر کے وہم وخیال سے ہی غش کھا جاتے ہیں اور وہ اسلام دشمن طاقتوں کے فریب و بہلاوے میں آکر شریعتِ اسلامیہ کے خلاف نعرے بازی کرتے ہیں اور اس کو بربریت ، ظلم و تم ، تلخ و درشت اور وحشیانہ پن کے لیبل لگا کر اسلام کے تقدس کو مجروح کرتے ہیں ۔جیسا کہ مصلحین نے انجیل کے قوانینِ مقدسہ کی بے حرمتی کی تھی ۔ مثلاً چوری کی سزا صرف اور صرف ایسے معاشرے میں نافذ کی جا سکتی ہے ، جہاں اسلامی معاشی نظام ٹھیک طور سے رائج ہو ، نہ کہ ایسی سوسائٹی میں ، جس کا تمام تر انحصار سود ، معاشی استحصال اور غیر منصفانہ تقسیمِ دولت پر ہو ۔ اسلام کا قانونِ شہادت بہت کڑا اور سخت ہے اور ججوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اس امر کو یقینی بنائیں کہ گواہ اور شاہد شہادت دینے میں کسی قسم کی غلطی تو نہیں کر رہا۔ مبادا اس کی غلطی کی پاداش میں ایک طرف تو معصوم و بے گناہ سزا پا جائے اور دوسری طرف مجرم بری ہو جائے ۔ قرآنِ مجید دو ٹوک الفاظ میں حکم دیتا ہے کہ جب ایک دفعہ جرم صحیح طور سے ثابت ہو جائے ۔تب نہ تو مجرم سے کسی قسم کی ہمدردی و نرمی برتی جائے اور نہ ہی اس کی جانب سے پیش کردہ سفارش اور رشوت قبول کی جائے ۔ اس موضوع کی بابت مزید تفصیلات کے لیے تفہیمات از مولانا مودودی مرحوم و مغفور کی کتاب ، حصّہ دوم کا متعلقہ مضمون ملاحظہ فرمالیں۔

(لاہور ، ۱۹۸۰ء ، صفحات ۳۳۷ تا ۳۴۷) ۔

فقید المثال اور قابلِ تقلید قوانین

اسلامی سماجی مساوات اور اسلامی تعزیری انصاف کی حیثیت بطور فقید المثال اور قابلِ تقلید مانی جا چکی ہے ، حتیٰ کہ غیر مسلموں اور اسلام دشمنوں کی جانب سے بھی ۔ اس لیے پاک و بھارت برصغیر

سے صرف ایک مثال کا حوالہ ہی کافی اور بڑا تسلی بخش ہے۔

۱۹۳۳ء میں آنجہانی کرم چند گاندھی نے جو عام طور پر مہاتما گاندھی کے نام سے مشہور و معروف تھے، اپنے کانگرسی رہنماؤں کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، خلفائے راشدین کے پسندیدہ اور ہر دلعزیز خصائل کی ریس اور پیروی کرنے کی ہدایت کی تھی جب انہوں نے بھارتی قانون مجریہ ۱۹۳۵م کے تحت، بھارت میں شریک و شامل سات صوبوں میں اپنی وزارتیں قائم کیں تھیں اور حکم دیا تھا کہ اسی طرز و منہاج کی حکومت قائم کی جائے۔ اس پیروی اور متابعت کی وجہ یہ تھی کہ آنجہانی مہاتما گاندھی تمام تاریخِ عالم میں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے سوا کوئی بہتر اور افضل شخصیت معلوم نہ کر سکا۔ اس کا یہ بیان "ہریجن اخبار" میں جولائی و اگست ۱۹۳۷ء کے وسط میں چھپا تھا۔